حرفِ نمو

شعری مجموعہ



علامہ طالب جوہری

حرفِ نمو

شعری مجموعہ

علاّمہ طالب جوہری

سخنور	علامہ طالب جوہری
تدوین	مشکور حسین یاد ، سرفراز ابد
تزئین	ید اللہ حیدر
خطاطی	جمیل احمد قریشی مرحوم ، زبیر ابن جمیل احمد قریشی
ناشر	ذوالفقار علی شیخ
تعداد	ایک ہزار
قیمت	۲۵۰ روپیہ
سنِ اشاعتِ اوّل	۱۹۹۶ء

سرِ آغاز

حدودِ سود و زیاں سے آگے قدم نکلتا نہیں کسی کا
جہاں نے لیں کروٹیں ہزاروں، مزاج بدلا نہ آدمی کا

یہی تمدن کا ماحصل ہے، یہی ہے تہذیب کا تقاضا
کوئی تو بیٹھا مزے سے تاپے، مکان جلتا رہے کسی کا

چمن میں ہر پنکھڑی بکھر کے کہے گی رودادِ قیدِ ہستی
بمقتضائے اصولِ فطرت ابھی تو منہ بند ہے کلی کا

نظم

قصیدہ

غزل

نظم

قصیدہ

غزل

نظم

حمد

میں فلک کی اک بشارت، میں زمیں کی اک نشانی
انھیں بے دلیل باتوں میں گزار دی جوانی
نہ فلک نے کی توجہ
نہ زمیں نے حال پوچھا
نہ کوئی جواب پایا
نہ کوئی سوال پوچھا
نہ کبھی فنا پہ سوچا
نہ کبھی مآل پوچھا

مری خواہشوں ذروں کو مرے تجربوں نے جانا
مجھے راستوں نے پھینکا، مجھے منزلوں نے چھانا

کبھی دھوپ دشت دل کی
کبھی جب جگنوؤں کا سایا
کبھی خمارگی کی چھائیں
کبھی چاندنی کی مایا
کبھی روح نے صدا دی
کبھی بھوت نے ڈرایا

مری بے تعلقی نے مجھے ہر نفس بچایا
نہ جھکا کسی کے آگے نہ کسی سے خوف کھایا

نہ طلسمِ سامری سے
نہ کلیم کے عصا سے
نہ امیرِ بے کرم سے
نہ فقیرِ بے نوا سے

نہ تکلّفِ خودی سے
نہ تصوّرِ خدا سے
سرِ راہِ زندگانی، میں چلا قلندرانہ
مرے سامنے زمیں تھی، مری پشت پر زمانہ
کسی راہِ بے جہت میں
مجھے کاہشوں نے ٹوکا
کسی سمتِ بے نشاں میں
مجھے فلسفے نے روکا
کہیں بندگی کا دھوکا
کہیں آگہی کا دھوکا
نہ زمیں سے کوئی مطلب، نہ غرض کوئی زماں سے
نہ روابط آسماں سے، نہ علاقہ کہکشاں سے
کبھی آب و گل پہ خنداں
کبھی حالِ دل پہ گریاں
کبھی ہمرہِ غزالاں
کبھی ہمرہی پہ نالاں

دمِ رزم آبِ خنجر

سرِ بزم تابِ جولاں

ہوئیں راکھ کتنی صدیاں، مگر آج بھی ہے جاری

وُہی رسمِ دام و دانہ، وُہی طرزِ جاں شکاری

وُہی مندروں کی گھنٹی

وُہی کاہنوں کے منتر

وُہی معبدوں کی دستک

وُہی بتکدوں کے پتھر

نہ صنم مرا سہارا

نہ صمد مرا مقدر

مرا ہر قدم ہے دھوکا، مرا ہر نفس ہے سپنا

وُہ جو مجھ میں بس رہا ہے وُہ پرایا ہے نہ اپنا

مرے راستے کے پتھر

یہ عرض یہ جسم و جوہر

یہ سمندروں کی موجیں

یہ سکندروں کی فوجیں

یہ عبادتوں کی راتیں
یہ ریاضتوں کی گھاتیں
یہ محبتوں کے پیکر
یہ عداوتوں کے لشکر
مرے سر سے سیل بن کر یہ سبھی گزر چکے ہیں
شب تار کی لحد میں مجھے دفن کر چکے ہیں

مرے جسم و جاں پہ طاری
کوئی شعلۂ فروزاں
کوئی رمز آشکارا
کوئی نور بے نہایت
کوئی موج بے کرانہ
کوئی سمت جادۂ

یہ پیام دے رہا ہے سرِ راہِ زندگانی
میں فلک کی اِک بشارت میں زمیں کی اِک نشانی

میں فشردۂ حقائق

میں چکیدۂ معانی

میں وُجود کی حقیقت

میں شعور کی کہانی

میں ازل کا سوزِ پنہاں

میں ابد کی شادمانی



دل کہ اک طوفاں زدہ کشتی بہ موجِ اشکِ غم
جس کا افسانہ شکستہ بادباں پہ ہے رقم

دل کہ گھر اللہ کا لیکن بتوں کی جلوہ گاہ
فطرتاً وہ کس قدر معصوم لیکن متہم

اور اس تہمت کے پس منظر میں اُن جذبوں کی دھوم
جن کی ہر لغزش خود اپنی حد میں بے حد محترم

آدمی اک بے سہارا ناؤ مانجھی کے بغیر
زندگی اندھے ارادوں کا تلاطم یم بہ یم

اس قدر حساس کر دیتا ہے کربِ زندگی
دل میں چبھ جاتا ہے کوئل کی نوا کا زیر و بم

وہ کسی کوہِ ندا نے دور سے آواز دی
بے خیالی میں بڑھے آواز کی جانب قدم

پاؤں بڑھتے جا رہے تھے اپنی منزل کی طرف
منتظر تھی گود پھیلائے ہوئے شامِ الم

جھٹ پٹے کے وقت بستی کے مکانوں سے پرے
گاؤں کے پنگھٹ پہ دو پرچھائیاں ہوتی تھیں ضم

اک کلی کے قامتِ زیبا پہ بھونرے کی نگاہ
ناپتی جاتی تھی جسمِ مرتعش کا پیچ و خم

راہرو گم تھا طلسمی راستوں کے جال میں
نقشِ منزل دور ہوتا جا رہا تھا دم بدم

پھر اسی گم کردہ راہی کے افق پر چونک اٹھا
اک ستارہ، جس کے تیور میں ہلالِ نو کا خم

سرخ صحراؤں کی تپتی سرزمیں کے درمیاں
ایک نخلستان جو رکھے مسافر کا بھرم

زندگی کی منفعل بے چہرگی کی چھاؤں میں
ایک چہرہ جس میں صدیوں کی رفاقت کا حشم

جس نے بتلایا کہ ناقص ہے وجود انسان کا
آدمی کا دوسرا حصہ نہ ہو جب تک بہم

گاہ قربت کی سبیلیں گاہ ہجرت کی فصیل
گاہ دلداری کا امرت گاہ دلسوزی کا سم

گاہ فرصت کی گھڑی میں ایک جھولے کی طرح
دلبری کی پینگ لیتی مرمریں بانہوں کا خم

گاہ عرضِ حالِ دل پر بے رُخی کے باوجود
رازِ پنہاں کھول دیتا تھا نفس کا زیر و بم

گاہ ہنگامِ تبسّم اس کی آنکھوں کے غزال
نرم پلکوں کی گھنیری چھاؤں میں کرتے تھے رم

اِک روایت ہے قصیدے میں غزل کی چاشنی
برتتے دونوں ہی فنکارانِ ماضی ہوں کہ ہم

ورنہ اس سنجیدہ تر صنفِ سخن کی لوح پر
جب غزل لکھے تو پھر رُک رُک کے چلتا ہے قلم

اب یہ لازم ہے کہ اِس رنگیں بیاں انجام پر
زندگی کے کچھ خزاں افگن حقائق ہوں رقم

ذات اک مبہم تصور کیا وجود اور کیا عدم
عقل اک اندھی پجارن کیا خدا اور کیا صنم

حاسہ اک بے حقیقت کیف کیا سمع و بصر
خاصہ اک پُر فریب احساس کیا جود و کرم

مادّہ اک نارسیدہ جسم کیا ارض و سما
ماہیت اک ناشنیدہ اسم کیا خلق و قدم

الغرض اس زندگی کے بے نہایت پیچ و خم
ایک نقطے کے ہزاروں زاویے ہیں بیش و کم

ایک ہی نقطے کے دو رُخ ہیں زماں ہو یا مکاں
فلسفے نے ہم کو سمجھائے یہ اسرار و حِکَم

ایک ذرہ کا تموج یہ خلا کی وسعتیں
ایک لمحے کا تسلسل یہ زمانے کا بھرم

وہ کوئی ذرہ ہو یا لمحہ اساسِ کائنات
ہے وہی نورِ محمدؐ اس کی عظمت کی قسم

نور وہ جو رمزِ ایجاد و بقائے کائنات
نوعِ انساں پر ربوبیت کا بے پایاں کرم

○

پھونک کر دشتِ عرب کی کوکھ میں روحِ ارم
اک گھنیری چھاؤں پھیلا دی سرِ فرقِ اُمم

وہ قدیم انسان تخلیقِ جہاں سے بھی قدیم
جس کے احساسات کی تجسیم ہیں لوح و قلم

وہ بقا پرور کہ با معنی ہے مفہومِ جود
وہ فنا دشمن کہ اب اک لفظِ مہمل ہے عدم

وہ ازل آثار تعلیمِ ملائک جس کی بھیک
وہ ابد کردار جنت جس کے دروازے پہ خم

جس کے بل پر ناز کرتا ہے امانت کا مزاج
جس کے دم سے سانس لیتا ہے دیانت کا بھرم

اُس سے باتیں کر کے پالے ہم کلامی کا شرف
تھم، خُدا کے واسطے، اے نارسا ادراک تھم

اے قضا آگاہ مُرسل اے قدر پیما نبی
اے عمودِ خیمۂ جاں اے وجودِ کیف و کم

تو دیارِ آگہی میں رب کے ہونے کا نشاں
تو فصیلِ فہم پر توحیدِ خالق کا علم

عقل کی خاکِ تیمم ہے ترے قدموں کی دھول
فکر کا آبِ وضو ہے تیری پیشانی کا نم



ورق ورق میری داستاں ہے شکار ہوں اپنی آگہی کا
سمندروں سے فریب کھا کر سراغ پایا ہے تشنگی کا

میں اپنی مشکل پسند فطرت سے قرض لے کر جفاکشی کا
کہیں بیاباں میں جا بسوں گا جہاں اجارہ نہ ہو کسی کا

مری سماعت کے سارے جنگل نوا کے شعلوں سے جل رہے ہیں
مرے علاقے پہ قیس ذات نے جال پھینکا ہے روشنی کا

جہاں کہیں علم کی قناعت نے وہم کے حوصلے بڑھائے
وہیں تعقّل کی مُخبری نے غرور توڑا ہے بندگی کا

میں اپنے باطن کے زلزلوں کی تباہ کاری سے بچ تو نکلا
کھڑا ہوں آتش فشاں کی زد پر بھلا ہو احساسِ کمتری کا

یہ شہرِ اہلِ کرم ہے طالب یہ لوگ ہیں لائقِ تماشا
ہو خواہشِ پیشِ غالب تو سوانگ بھر لو گداگری کا





اس کی سرد حویلی تک دُھوپ کا تپتا صحرا تھا
اوٹ میں سُوکھی جھاڑی کے سایہ چھپ کر بیٹھا تھا

گُونج رہی تھی جب یہ صدا اسماء کی تشریح کرو
بول رہا تھا صرف انساں، چار طرف سناٹا تھا

ماہی گیر اکیلا تھا، لوٹ کے کیسے گھر آتا؟
ناؤ کے چپّو ٹُوٹے تھے اور سمندر گہرا تھا

ہم نے جو گھر بار تجا ایک ستارے کی خاطر
ان دیکھی دُنیاؤں سے ایسا کون سا رِشتہ تھا

فِطرت کی بے ظرفی بھی کیا کیا رُوپ بدلتی ہے
آگ لگی تھی جب گھر میں ٹُوٹ کے بادل برسا تھا

سایہ بانٹنے والا خُود سائے سے محروم رہے
قسمت نے اِن پیڑوں کو دُھوپ میں جلنا لکھا تھا

کوزہ گروں کی بستی میں مٹی کی کمیابی ہے
کوزے کتنے مہنگے تھے پانی کتنا سستا تھا

اِک موہوم نشانی پر طالب ہم نے کُوچ کیا
منزل بھی انجانی تھی رستہ بھی اَن دیکھا تھا

طواف کرتا ہے اک پرندہ صنوبروں کا
کہ تیز آندھی میں کیا بھروسہ ہے شہپروں کا

میں اپنی یادوں سے کوئی صورت تراش لوں گا
میں کس خوشی میں اٹھاؤں احسان پتھروں کا

دیارِ وحشت میں کوئی نقارہ بج رہا ہے
نواحِ دل سے قریب ہے کوچ لشکروں کا

وہ دیکھتا ہے طویل راتوں میں خواب اکثر
پہاڑیوں سے نشیب میں گرتے پتھروں کا

زمین کے زخم دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں
گناہ یہ فوجیوں کا تھا یا سکندروں کا

وہ فتحمندی کا اک نشاں تھا کہاں گیا وہ
اسی علاقے میں ایک مینار تھا سروں کا

ہم آج آ بیٹھے تیرے در پر سو ہم سے مل لے
کہ ہم قلندر ہیں کیا بھروسہ قلندروں کا

ہماری بستی کے غوطہ خوروں میں دم کہاں ہے
کہ موتیوں سے مزاج پوچھیں سمندروں کا

اُلفت کی رسم و راہ سے اتنا وہ بے پروا نہ تھا
کل اجنبی بن کر ملا، پہلے تو وُہ ایسا نہ تھا

اِس سال کے سیلاب سے سارے کنارے کٹ گئے
دریا کے پیچ و تاب کا ساحل کو اندازہ نہ تھا

جب قربتوں کی چھاؤں میں اُترے حیا کے قافلے
بڑھتے قدم خُود رُک گئے آگے کوئی رستہ نہ تھا

پھلوں کی چھال توڑ کر رزقِ زمیں بنتے رہے
ان آنسوؤں کے واسطے ترکِ وطن اچھا نہ تھا

کیا خبر قسمت کا کھیل عجب ہوتا ہے یہاں
دریا میں باڑھ آئی وہاں بادل جہاں برسا نہ تھا

طالب دریچہ ذہن کا جب ذات کے اندر کھلا
پلکیں ادھر جھپک کر اٹھیں اور دور تک صحرا نہ تھا

جبیں کو بے جہتی کے ہنر نے چھین لیا
مری نگاہ کو میرے ہی سفر نے چھین لیا

ہے کس کے دستِ کرم میں مہارِ ناقۂ جاں
سخن کا لطف غمِ شہرِ ہنر نے چھین لیا

میں اپنی روح کے ذرّے سمیٹتا کیوں کر
یہاں تک کہ وہ مٹی جسے کوزہ گر نے چھین لیا

بھٹک رہے ہیں جوانی کے نارسا لمحات
بہت سے گھر تھے جنھیں اک سفر نے چھین لیا

بقولِ غالبِ دانا گزر ہی جاتی ہے عمر
مگر اسے بھی ترے رہگزر نے چھین لیا

شکارگاہ شکاری کے خوں سے رنگیں ہے
زمیں کا رزق کسی جانور نے چھین لیا

سفر کی روح تھا یہ ذوقِ جستجو طالب
جسے چراغِ سرِ رہگزر نے چھین لیا



اک نیا منظر ہر اک کاوش کے پس منظر میں تھا
کوہ پیمائی کا سودا کوہکن کے سر میں تھا

ہر اضافت سے جدا ہوتا تو تجھ کو جانتا
آدمی وقت و مکاں کے گنبدِ بے در میں تھا

دستِ قاتل کا ارادہ سب پہ ظاہر تھا مگر
سب سے پوشیدہ تھا وہ مفہوم جو خنجر میں تھا

کون بتلائے کہ بے معنی ہے اشیاء کا تضاد
یہ حقیقت ہے کہ ہر چیز اک خنجر میں تھا

جسم کی دیوار سے ٹکرا کے نظریں مڑ گئیں
لوگ باہر ڈھونڈتے تھے اور میں اپنے گھر میں تھا

چشمِ بستہ تھا میں آوارۂ دشت و جبل
جب کھلیں آنکھیں تو میں لیٹا ہوا بستر میں تھا



جیسے ہی زینہ بولا تہہ خانے کا
کنڈلی مار کے بیٹھا سانپ خزانے کا

ہم بھی خام طلب تھے اپنی فطرت میں
وہ بھی کچھ کچا تھا اپنے نشانے کا

اب اپنی ذات میں شہر آباد کریں
در کے باہر پہرا ہے ویرانے کا

وقت کی قینچی اس کے پروں کو کاٹ گئی
شمع سے رشتہ ٹوٹ گیا پروانے کا

برسے کیا بے فیض زمیں پر ابرِ کرم
خاک کا ہر ذرہ مقروض ہے دانے کا

صبح سویرے شبنم چاٹنے والے پھول
دیکھ لیا خمیازہ پیاس بجھانے کا

بات کہی اور کہہ کر خود ہی کاٹ بھی دی
یہ بھی اک پیرایہ تھا سمجھانے کا

طالب اُن کو پانا تو دشوار نہ تھا
اندیشہ تھا خود اپنے کھو جانے کا

جذبوں کا بہاؤ کم نہ ہوگا
دریا کا چڑھاؤ کم نہ ہوگا

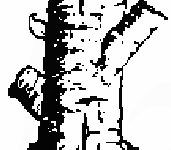
بجھ جائے انا کی آگ لیکن
اس آگ کا تاؤ کم نہ ہوگا

کتنی ہی رسد بڑھے ہوس کی
اس جنس کا بھاؤ کم نہ ہوگا

باہر کی ہوا تو یخ زدہ ہے
اندر کا الاؤ کم نہ ہوگا

کیا دل کی کماں چڑھی رہے گی
کیا اس کا تناؤ کم نہ ہوگا

باوصفِ خطرۂ شوقِ دریا
اے ڈوبتی ناؤ کم نہ ہوگا



کہیں بدن تشنگی کا صحرا کہیں بدن بے کنار دریا
رفاقتوں کا حریص صحرا کدورتوں کا شکار دریا

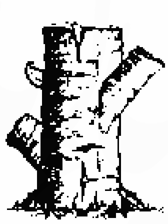
چناب کے خشک ساحلوں پر گزر گئی خشک لب جوانی
ہم اس کو پاتے تو کیسے پاتے کہ وہ تھا دریا کے پار دریا

ذرا سی اک آبجو سے ہم نے سنبھالی پیاس اپنی نارسی کی
ہماری سیراب خواہشوں کو ملا کریں اب ہزار دریا

خزاں کے موسم کی چیرہ دستی بدن کے کپڑے بھی لے گئی ہے
لباس تھا اپنی بے زری کا پھٹا ہوا تار تار دریا

وہ ایک جز تھا جو اپنے کُل کی طلب میں حیران و مضطرب تھا
کھلے سمندر کی کھاڑیوں میں اُتر گیا بے قرار دریا

میں اپنی کشتی چلا رہا تھا غمِ زمانہ کے ساحلوں پر
نگاہِ حسرت سے تک رہا تھا مجھے مرا غمگسار دریا





ہے روحِ سحر بستہ ایک جہاں بستی تانا کیا
بدن کی بالغی سلامت، لہو کی گرمی کو مانا کیا

بفیضِ تقدیر اپنے اجداد ہی کا ہم دوش جسم ہیں
جو زندگی خود گزر رہی ہو تو زندگی کو گزارنا کیا

شبِ ملامت کی روئی آنکھو تمہارے اشکوں کے موتیوں میں
جو اب لو دے رہی ہے اس کو، پرائے جلووں پہ وارنا کیا

میں روشنی سے لطیف تر ہوں مگر عناصر کی قید میں ہوں
ابھی مرے دل کے بتکدے میں نقوشِ وحدت ابھارنا کیا

مرے چمن سے بہار کا آخری پرندہ بھی اڑ چکا ہے
بہار ہی جب نہ جیت پائی تو میرا پت جھڑ سے ہارنا کیا

میں خود مداوا ہوں اپنی تنہائیوں کا اس حجرۂ بلا میں
پرانی یادوں کے لشکروں کو مدد کی خاطر پکارنا کیا

قدیم جذبوں کے بر میں طالب جدید لفظوں کا پیرہن ہے
نئے تخیل کو باندھنا کیا غزل کے گیسو سنوارنا کیا



گاؤں کے اِک چھوٹے سے گھر میں کچھ لمحے مہتاب رہا
لیکن اُس کی یاد کا پودا برسوں تک شاداب رہا

اے میرے حال کی دشمن یادو! کیا اُس کو تسکین ملی
ماضی میں جو شخص حریفِ تسکینِ اعصاب رہا

اپنی ساری گُم شدہ بھیڑیں جب تولیں چرواہے نے
ان بھیڑوں کے پیچھے پیچھے پورے دن بے تاب رہا

فصلِ خزاں کی شاخ سے لپٹا بیلے کا اِک تنہا پھول
کچھ کلیوں کی یاد سمیٹے راتوں کو بے خواب رہا

بچھڑے تھے تو ساکت پلکیں سوکھے پیڑ کی شاخیں تھیں
اُس سے بچھڑ کر دور چلے تو کوسوں تک سیلاب رہا

پچھلی رات کے پہلے لمحے جن کلیوں میں بیت گئے
اُن کلیوں کو چھوڑ کے پورے شہر میں قحطِ آب رہا

جسم نے اپنی عمر گزاری سندھ کے ریگستانوں میں
دل کم بخت بڑا ضدی تھا، آخر تک پنجاب رہا

اُس کی فطرت جاننے والے ترکِ ادب سے جیت گئے
کتنا تنگ نظر تھا طالب، پابندِ آداب رہا

اندھی رات کے چہرے پر تاریکی کا غازہ تھا
دھیان کی اٹھتی موجوں میں جذبوں کا آوازہ تھا

یوں تو زخم اور مرہم میں اک فطری سمجھوتا ہے
لیکن مرہم کیا کرتا زخمِ محبت تازہ تھا

باسی پھول کی خوشبو نے سارے عقدے کھول دیے
اُس کے ہاتھ کی مہندی سے پہلے صرف اندازہ تھا

ہم کو مقدر چھوڑ گیا اور کسی در پر ورنہ
جس پر دستک دینی تھی وہ اُس کا دروازہ تھا

اک مستحکم رشتہ ہے بستی کا ویرانے سے
گھر میں موتی بکھرے تھے جنگل میں شیرازہ تھا

بستی کی پگڈنڈی سے گزرے تھے کچھ لوگ ابھی
طالب ہم کو کیا معلوم ڈولی تھی کہ جنازہ تھا



جب نغمہ زن تھیں آہیں، جب بخت مہرباں تھا
اپنی بھی اک زمیں تھی، اپنا بھی آسماں تھا

اب ہم ہیں اور گماں پر اندیشۂ یقیں ہے
اک روز ہر یقیں پر اندیشۂ گماں تھا

خشک ہو گئے ہیں آنسو کے علاوہ
جو ہے وہ رائیگاں ہے، جو تھا وہ رائیگاں تھا

میں جب کھڑا ہوا تھا حرفوں کے سائباں میں
معنی کی ہر جہت میں اک دشتِ بے اماں تھا

اُس واقعے کی بابت پہروں یہ سوچتا ہوں
وہ ہے تو کیوں نہیں ہے، وہ تھا تو پھر کہاں تھا

کل شب مری رگوں میں بجلی چمک رہی تھی
بادل گرج رہے تھے، کل شب وہ میہماں تھا

جب حرفِ شرمساری اُس کے لبوں پہ جاگا
وہ لمحہ تو اصدیوں سے بھی گراں تھا

ہم نے بھی ترک کر دی اب جسم کی سکونت
سایوں کی سرزمیں بھی آسیب کا مکاں تھا

کل مجھ پہ خوب برسے رشک و حسد کے پتھر
تاروں کی انجمن میں یاروں کے درمیاں تھا

تھا جشن ناچ خوشی بھوتوں کے اپنے گھر میں
سنسان تھے علاقے اور خوف کا سماں تھا



لفظ و معنی کیا ہیں حرف و صوت کی دنیا ہے کیا
دل نے سمجھا یا نہ سمجھا کیا اور عقل نے سمجھا ہے کیا

یہ زمیں کیسی ہے اور جنگل کا سناٹا ہے کیا
ہاتھیوں کا غول اس میدان سے گزرا ہے کیا

کیوں پرندے اپنے اپنے گھونسلوں سے اڑ گئے
ان گھنی شاخوں میں پوشیدہ کوئی چیتا ہے کیا

اس کو جھنکنے کی صدا نے ریزہ ریزہ کر دیا
ضد ہے ہنگامے کی ورنہ اور سناٹا ہے کیا

مطمئن ہے کھول کر مخفی خزانوں کے کواڑ
اپنی پونجی سے وہ میری طرح بے پروا ہے کیا

مجھ کو مل پایا نہ کیوں اپنی ہی ہستی کا سراغ
آگہی میری چراغِ دستِ نابینا ہے کیا

میرا ہونا کب ہوا میرے نہ ہونے سے بڑا
اور اگر ہونا بڑا ٹھہرا تو پھر اچھا ہے کیا

اک دھماکہ ہے سبب اس عالمِ موجود کا
فلسفے نے اس دھماکے کا سبب لکھا ہے کیا

اس کے چہرے کی تھکن میں کھو گئے بستی کے رنگ
یہ مسافر آج ہی پردیس سے پلٹا ہے کیا

غنچگی کا سفر

وہ نوجوان امنگوں کی گرم بازاری
محیطِ ذات وہ اک بیکراں خود آزاری

وہ تمتماتے ہوئے دن وہ سانولی راتیں
وہ کمسنی کا تموّج وہ دل کی سرشاری

وہ سن کہ جس نے بس اک لذتِ نظر کے لیے
نہ جانے کتنے دریچوں سے کی وفاداری

وہ سن کہ تند حواس، جذبہ، قوت احساس
کہ ہر خوشی پہ ہو اندوہ مستقل طاری

کبھی بدون سبب ہی خوشی کی کیفیت
کبھی یہ حال کہ بے وجہ گریہ و زاری

کبھی عتاب بزرگاں کے خوف سے پیدا
گلی کے موڑ پہ بے وجہ تیز رفتاری

کسی کا عکس طلائی گلے لگاتے ہوئے
اداس رات کی تنہائیوں میں بیداری

کبھی کسی سے اچانک جو سامنا ہو جائے
تو سنسنائے رگ و پے میں کیف سرشاری

اگر لبوں سے تبسم کی اک کرن پھوٹے
تو چاندنی میں نہا جائے رات اندھیاری

وفورِ شرم سے پلکیں اگر جھپک جائیں
دل و جگر میں ترازو ہوں برچھیاں ساری

کبھی گر اُس رُخِ تابندہ پر ہو گردِ ملال
تو اپنی جاں سے نہیں دو جہاں سے بیزاری

قدم قدم پہ شکستِ خیال کا ماتم
گلی گلی میں تمناؤں کی عزاداری

کبھی ہجومِ تمنا میں عرضِ حال کے وقت
کسی غزالِ ہراساں کی تیز رفتاری

کسی ستارۂ تنہا کا ارتعاشِ خفی
کسی الاؤ میں سہمی ہوئی سی چنگاری

ہوا کے رُخ پہ کسی بادبان کی لرزش
کسی چکور کی راتوں میں گریہ و زاری

لب سوال پہ ٹھٹکا ہوا کوئی مقصد
دیارِ غیر میں اک اجنبی کی دشواری

یہ غنچگی کا سفر تھا شگفتگی کی طرف
کہ جیسے خواب کی کروٹ میں عزمِ بیداری



کم دِلی

وہ فضا تے سبے کم و کیف تھی
نہ فراق تھا نہ وصال تھا
نہ رفاقتوں کا سرور تھا
نہ عداوتوں کا ملال تھا
اُسے دیکھنے کی خلش بھی تھی
اُسے دیکھنا بھی محال تھا
شب و روز ایک ہی حال تھا

اسی بے طرف کم و کیف میں
بڑے روز و شب یونہی ہو گئے
بڑے ماہ و سال گزر گئے

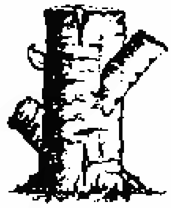
مگر ایک ساعتِ نیک میں
وہ مرے وجود کا تکملہ
دمِ اتفاق کہیں ملا
سرِ راہِ بختِ رسا ملا
وہ طلب تھا میرے وجود کی
میں ضرورت اس کی نمود کی

مگر اس کے دونوں عجیب تھے
کہ خود اپنے اپنے رقیب تھے

میں رہین اپنے سماج کا
وہ اسیر رسم و رواج کا

مجھے اپنے فرض کا پاس تھا
اُسے اپنے گھر سے ہراس تھا

وہ جو زخم تھے دل و جان کے
وہ سلے ہی کب جو ادھڑ گئے
بڑی کم دلی سے ملے تھے ہم
بڑی خوش دلی سے بچھڑ گئے



سچّا آئینہ

برسوں پہلے فصلِ بہار کی آمد پر
اک دن آنکھ نے یہ منظر بھی دیکھا تھا

ایک ظفر پیما شانِ عثمانی سے
آئینے کے سامنے وہ یوں بیٹھا تھا

ہاتھ میں خامہ، کاغذ پر نقشِ تحریر
سر کو جھکائے شاید وہ خط لکھتا تھا

جیسے صحنِ گلستاں میں طاؤس چلے
دستِ حنائی کاغذ پر یوں چلتا تھا

میری نظر اُس دورنگی سے حیراں تھی
آئینے میں عکسِ تو خط کا اُلٹا تھا

لیکن لکھنے والے کی صورت کا عکس
فنکاری کے پورے حسن سے اُبھرا تھا

ویسا ہی تھا آئینے کے باہر بھی
آئینے کے اندر چہرہ جیسا تھا

عکسِ رُخ سیدھا تھا عکسِ تحریر اُلٹا
جھوٹا تھا آئینہ پھر بھی سچا تھا

جواز

میں ایک خزاں دیدہ و آوارہ مسافر
دانستہ نکل آیا ہوں دُور اپنے وطن سے
اب سوچ رہا ہوں کہ جوانی کا یہ اقدام
کیا کوئی جسارت ہے روایاتِ کہن سے

اس طرح سے وجدان کے ہونٹوں پہ ہے نالہ
جیسے کوئی پابستہ مسافر سسک رہا ہے
یا جیسے کھنڈر میں کوئی منحوس پرندہ
پُر ہَول طریقے سے لگاتار کراہے

دُنیا کو غرض کیا ہے مری غم زدگی سے
کیوں سارا زمانہ مری جانب نگراں ہے
دِل خُوش ہو تو نالوں میں بھی اِک رُخ ہے طرب کا
دِل ٹُوٹے تو نغموں میں بھی اِک طرزِ فُغاں ہے

موتی کو نِکلنا ہی پڑا بطنِ صدف سے
ہر گُل چمنستانِ جہاں کا سفری ہے
ہر موجِ ہوا خانہ بدوشی کا ہے نوحہ
ہر ذرّے کی تقدیر یہاں دربدری ہے

پُھول جو زینت ہیں کسی جیب و قبا کی
گُلشن کی کسی شاخِ تمنا پہ کِھلے تھے
میدان کی وسعت میں یہ بکھرے ہوئے پتے
اِک روز ہواؤں کو درختوں پہ ملے تھے

تجدید

اس کے شہر کی ساری گلیاں، ساری سڑکیں
نیند میں ڈوبی
برف کی موٹی چادر اوڑھے
اونگھ رہی تھیں

بوڑھے چرچ کی ناآسودہ پراسرار عمارت
کہرے میں لپٹی
صدیوں کے اوہام سجائے
ہر آہٹ پر کان لگائے
جاگ رہی تھی

اور میں آتش دان کے آگے
کرسی رکھ کر
شام سے بیٹھا سوچ رہا تھا
ساری یادیں، سارے آنسو
ساری ہجر زدہ رومانی نظمیں
آتش دان کے انگاروں پر پھینک کے
گھر واپس جاؤں گا

دھند

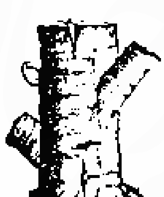
پچھلے سفر میں
لندن کے اک ترکی رستوران کے اندر
اس نے کہا تھا

"سارے کاموں کو نپٹا کر میرے پاس چلے آنا
رشتے ناطے
مستقبل کے سب منصوبے

جب تم اپنے دھندوں سے فارغ ہو جاؤ
میرے پاس چلے آنا پھر
ہم تم دونوں

اپنے جنوں کی شمع جلا کر
اپنے گھر کا گھور اندھیرا دور کریں گے
اور وہ گھر آباد رہے گا"

لیکن میں اک سندھی گوٹھ میں
پھونس کے چھپر والے ہوٹل کی کرسی پر
کب سے بیٹھا سوچ رہا ہوں
دنیا کے دھندے کس نے نپٹائے ہیں



بے انجام

تمہارے حشر ساماں
آبنوسی جسم پر پولیس کی یہ وردی بہت ہی دل رُبا ہے
تمہارے چہرۂ تاریک پر روشن ہیں قندیلیں حیا کی
تمہاری انکھڑیوں کے طاقچوں میں
نصب ہیں جلتی ہوئی شمعیں وفا کی
تمہارا ہر رویہ سادگی اور انکساری کی علامت ہے
تمہاری ہر ادا تہذیب پرور ہے
کہ اقوامِ مہذب کی شرافت سے فزوں تر ہے

مگر میں تو
سرابِ زیست کا وہ ذرّۂ باراں گزیدہ ہوں
کہ جس کی ہر جہت اِک شعلۂ خس ہے
میں وہ رُوحِ مسافت آزما ہوں
جس کی قسمت میں
کسی مخصوص خطّے سے وفا کرنا نہیں لکھا

تمہارے ساتھ جو بیتے ہیں
ان لمحوں کی دلکش گھنٹیاں کنجِ تصور میں
سدا بجتی رہیں شاید

یہ دنیا آتشِ سیال ہے
اس کے شناور راکھ ہو جاتے ہیں
میں بھی اپنے خاکستر پہ بیٹھا ہوں

بہت دن ہو گئے
اپنی زمیں سے رابطہ ٹوٹے
وہاں کچھ لوگ میرے منتظر ہوں گے

یہاں اِس برِّ اعظم کی کسی دیجور بستی میں
کوئی شب رنگ سی آغوش
اپنی شادکامی کی تمنّا میں
تمہاری منتظر ہوگی

مری پرواز کا یہ آخری اعلان ہے شاید
تو اچھا اب اجازت دو
خُدا حافظ



شام ہو گئی آخر

بے ستوں کے دامن میں
شام ہونے والی تھی

اک اداس بستی کے
تنگ قہوہ خانے میں
اس نے مجھ سے پوچھا تھا
تم کہاں کے شہری ہو

اپنے صاف لہجے سے
اپنے ہر رویے سے
مجھ کو ایسا لگتا ہے
جیسے تم مسافر ہو

پھر بھی اک خلش سی ہے
اجنبی سا چہرہ ہے
اجنبی سا حلیہ ہے
کون ہو تم اور کیا ہو

میں نے یہ کہا اس سے
میں بھی اک مسافر ہوں
کوہکن کی راہوں کا
میرے دوشِ محنت پر
آگہی کا تیشہ ہے
جوئے شیر کی خاطر

شب کہیں گزرتی ہے
دن کہیں گزرتا ہے

اس کے حرفِ شیریں نے
مشورہ دیا مجھ کو
چھوڑ دو یہ سیاحی
اور یہیں کے ہو جاؤ
ہم خیال ساتھی بھی
اک عظیم نعمت ہے

میری مصلحت بولی
بے خیال پردیسی
ہم خیال کیا ہو گا

میں وطن بدوش انساں
بے دیار و آوارہ
جنگلوں میں بے منزل
بستیوں میں بنجارہ

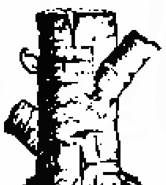
رُوح مضطرب میری
جسم بے ہدف میرا
عقل منتشر میری
ذہن بے طرف میرا

میں کہ ایک محور پر
گھوم ہی نہیں سکتا
میں کہ ایک غنچہ کو
چوم ہی نہیں سکتا

ہاں مگر یہ وعدہ ہے
میری بدھ مزاجی کو
مِل گیا اگر نروان
میں ضرور آؤں گا
پھر یہ بات ممکن ہے
میں نہیں کا ہو جاؤں

آج میں نے برسوں بعد
بے ستوں کی بستی میں
آ کے جب اُسے پُوچھا
تنگ قہوہ خانے کے
کہنہ سال مالک نے
زیرِ لب یہ بتلایا
وہ تو اپنے بچّوں میں
مطمئن بھی ہے خوش بھی

بے ستوں کے دامن میں
شام ہو گئی آخر



قصّہ ایک دن کا

پڑوسی ملک تھا
اور دور افتادہ سی بستی تھی
کنارِ چشمۂ کہسار
ہم سروِ سہی کے جھنڈ میں اک دوسرے کے پاس بیٹھے تھے
جدائی کے تصور سے غبار آلود تھے چہرے
فشارِ ضبطِ غم سے مضمحل تھے جاں بہ لب سے
زباں پر جاں کنی کا کرب طاری تھا

مجھے کہنا تھا اک حرفِ تسلی
اور اُسے اک بات کا اقرار کرنا تھا
مجھے بھی اپنے جذبے بیچنے تھے
اور اُسے بھی اپنے احساسات کا اظہار کرنا تھا

کہا میں نے
کہ سارے فاصلے ہم ختم کر دیں گے
مسافت ختم ہو جائے گی جسموں کی

کہا اس نے
کہ ہاں ساری مسافت ختم ہو جائے گی
اور پھر یہ کہ قومیت کی نادیدہ مسافت بھی

مگر سوچو تمہاری اپنی ترجیحات کیا ہیں
یہ ترجیحات کی دُنیا ہے اور دُنیا کے ھنگامے
سدا یونہی رہیں گے



رنگ محل کے ایوانوں میں

رنگ محل کے ایوانوں میں
نظریں رستہ بھول چکی تھیں
سرخ شفق کی نازک کلیاں
حدِ نظر تک پھول چکی تھیں
دلداری کی پینگ بڑھا کر
باہیں جھولا جھول چکی تھیں

دوری کے شب رنگ افق سے
پھوٹ چکا تھا شوخ سویرا
دل کے بھیانک ویرانے میں
عارض و لب کرتے تھے بسیرا

رات کے ہر بیکل لمحے پر
زلفیں ڈال چکی تھیں ڈیرا

دل، بے تاب بگولا سا دل
محلوں کی رسمیں کیا جانے
خود نگری سے ٹھوکر کھا کر
ٹوٹ گئے لاکھوں پیمانے

رنگ محل کے ایوانوں سے
نظریں رشتہ توڑ چکی ہیں
نرم ادھوری نور سی یادیں

خواب کا دامن چھوڑ چکی ہیں
بُجھتے دِیے کی ساری اُمیدیں
محلوں سے مُنہ موڑ چکی ہیں

وقت کے ریتیلے صحرا میں
سوچیں مُجھ سے پُوچھ رہی ہیں

خوش فہمی کے رنگیں نغمے
نالوں میں کیوں ڈھل جاتے ہیں
ہم سفروں کو چھوڑ کے ساتھی
کیسے دُور نکل جاتے ہیں

اپنی انا کے خول میں پنہاں
جب تک یہ اِنسان رہیں گے
لب کے ہزاروں عہد و پیماں
دِل کے لیے انجان رہیں گے

پچھلے پاؤں

نیم شب کا عمل ہے بستی پر
راستے کی اداس قندیلیں
سر جھکائے ہوئے غنودہ ہیں

وقت کی پیچ دار گلیوں میں
دل کو یاد آرہے ہیں رہ رہ کر
وہ ترانے جو نا سرودہ ہیں

اور میں سوچتا ہوں بے مقصد
قرض ہیں آج کس کے ناخن پر
غم کی گرہیں جو ناکشودہ ہیں

کھینچ لی کس نے رُوح جذبوں کی
آج کیوں کند ہو گئے یک لخت
سارے حربے جو آزمودہ ہیں

کس سے پُوچھوں کہ اپنے زخموں پر
کس کے ناخن تلاش کرتا ہوں
روز بُنتا ہوں راز کے جالے
روز پھر ان کو فاش کرتا ہوں

اس سے پہلے بھی ایک دن شاید
میں انہیں اُلجھنوں سے گزرا تھا
اپنی محرومیوں کے حلقے میں
خود سے ملتا تھا اور بچھڑتا تھا

چار جانب تھے اَن گنت سائے
دل مگر انجمن میں تنہا تھا

آج پھر ان اداس لمحوں میں
رُخ بدلتی ہے وقت کی پرواز
دستکیں دے رہی ہے پلکوں پر
بیتے لمحوں کے کرب کی آواز

اگلے دن پھر سے لوٹ آئے ہیں
درد کے جال بُن رہا ہوں میں
کوئی منظر نظر میں رقصاں ہے
کوئی آواز سُن رہا ہوں میں

○

دُور شط العرب کے ساحل پر
پھیلتا جا رہا ہے اندھیارا

دھند ہے سرمئی فضاؤں پر
شام کا بج رہا ہے نقارا
آسماں کے کشادہ آنچل میں
مسکرانے لگا وہ اِک تارا

روشنی ہو گئی جہازوں پر
سو گیا سطحِ آب پر دھارا
ایک ٹوٹی ہوئی سی کشتی میں
مست و مدہوش کوئی دُکھیارا

گا رہا ہے اداس لہجہ میں
بیتے لمحوں کی داستانوں کو
جو کبھی اُس کے دل نے گائے تھے
چھیڑتا ہے انھیں ترانوں کو

"جس کے ساحل پہ ہم ملے تھے کبھی
آہ! شاید یہ وہ فرات نہیں

یہ فضائیں بھی کچھ اُداس سی ہیں
ان کھجوروں میں بھی وہ بات نہیں

یہ جو بہتا ہے نرم رَو دریا
اس کی لہروں میں شعلگی کیوں ہے
یہ کراہیں کہاں سے اٹھتی ہیں
یہ ہواؤں میں چیخ سی کیوں ہے"

گیت کے بول کتنے گہرے ہیں
درد کتنا ہے ان ترانوں میں
جیسے کوئی لحد کے روزن سے
جھانکتا ہو گئے زمانوں میں

پھر وہی درد جاگ اٹھا جس سے
وحشتِ نا گُسل اُبھرتی ہے
ذہن میں پھر وہ رہگزار بنی
جس سے دیوانگی گزرتی ہے

○

ہاں یہی رہگزار ہے جس سے
میں کئی بار اُس کی بستی میں
کبھی آیا ہوں بے ارادہ سا
کبھی حیلوں کی سرپرستی میں

دِل کو اِس جُرمِ ناروا کے سبب
عقل نے کتنی بار ٹوکا ہے
ایسی بے منزل آشنائی بھی
درحقیقت حسین دھوکا ہے

اور یوں بھی ہوا ہے بعض اوقات
پاس اُس کو کبھی جو پایا ہے
مَلگجی چاندنی کے سائے میں
قصۂ غم اُسے سُنایا ہے

یہ سمجھ کر بھی اس کی خواہش کی
لوگ دشمن ہیں، دمن پرایا ہے

بارہا یہ بھی دل میں ٹھانی ہے
کہ زمانے میں آگ لگوا دوں
توڑ لوں زندگی سے ہر ناتا
اس خدائی سے خود کو ٹکرا دوں

اور جب یہ طلسم ٹوٹا ہے
خود کو کیسا لٹا لٹا پایا
روز اس رہگزر سے پلٹا ہوں
روز خود کو وہیں کھڑا پایا

آج مایوس ہو گیا ہوں میں
آج دل بھی بہت پریشاں ہے
آج یہ رہگزار بھی خاموش
میری محرومیوں پہ حیراں ہے

آج محسوس کر رہا ہوں میں
کہ مرے اس جنوں کا پس منظر
غمِ جاناں کی بے ثباتی ہے
(یا طلب کی کم التفاتی ہے)
حادثہ کتنا نفسیاتی ہے

غمِ جاناں کے ہر حوالے میں
غمِ دوراں کا امتزاج بھی ہے
کچھ خطا وار ہے تعلق بھی
کچھ گنہگار یہ سماج بھی ہے

دلبری کے مزاج میں پنہاں
مصلحت کی کرشمہ زائی ہے
(یعنی اندازِ بے وفائی ہے)

جذبِ صادق نے ہر زمانے میں
دلبری سے شکست کھائی ہے

آج پھر وقت پچھلے پاؤں چلا
آج پھر دل کی باگ چھوٹ گئی
آج پھر پائے آگہی پھسلا
آج پھر اک فصیل ٹوٹ گئی



اپنے ماضی میں سفر اور کس قدر ہمت شکن
رتجگوں کے گیت بن جاتے ہیں آنکھوں کی جلن

کھل اٹھے پھر حافظے کے کنج میں یادوں کے پھول
”مجھ کو بھیروں یہ سنانے لگا مرغِ چمن“

ایک اک بچھڑا ہوا لمحہ ہے مجھ سے ہم کلام
”تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن“

عالمِ تمثیل میں ٹھہرا ہوا اک کارواں
عہدِ رفتہ کی برات اور ساعتوں کی انجمن

نیش زن میں حافظے پر کتنے آنچل کتنے روپ
گود پھیلائے ہوئے ہیں کتنی گلیاں کتنے بن

وہ بھی کیا دن تھے جب اُس کے جسم کی محراب میں
ہر ادا اِک لفظ تھی ہر کیفیت تھی اِک سخن

اِک تحیّر کی علامت نیم وا ہونٹوں کی قوس
اِک تذبذب کی حکایت چونک اٹھنا دفعتہً

لرزشِ اقرار یعنی اُس کی آنکھوں میں کنول
جُنبشِ انکار یعنی اُس کے ماتھے پر شکن

لفظ قاصر ہیں سماجی بندشوں کے خوف سے
استعارے کے لیے مجبور ہیں نطق و دہن

ریشمِ الفت لمس کی فردوس ریشم کا جسد
حدِ قربت سانس کی عشرت چنبیلی کا بدن

پھر وہ اک لمحہ کہ جب یہ چوٹ بھی سہنی پڑی
جس کو ہم اپنا سمجھتے تھے پرایا تھا وہ دھن

اس بھری دنیا میں تنہائی کا احساس شدید
اب بھی راتوں کو بڑھا دیتا ہے سینے کی جلن

کوہساروں کی شبِ مہتاب اور تنہا چکور
جنگلوں کی دوپہر اور راہ گم کردہ ہرن

لیکن اس شہرِ شغالاں میں غزل گوئی کا شوق
عصرِ حاضر کی تضاد آمیز کیفیت کا فن

جیسے اک سنسان صحرا میں نہتا قافلہ
اور تعاقب میں اجل بردوش بھوکے راہزن

ایک سوداگر سفر کی زحمتوں سے بے نیاز
بیچنے نکلا ہوا افریقی کنیزوں کے بدن

ایک شہزادہ محل کی سازشوں سے بے خبر
روز و شب سجتا ہوا اپنی خلوتوں کی انجمن

بن چکی ہے زندگی کی ہر رسد جنسِ گراں
راہبر کے تند لہجے سے نمایاں ہے تھکن

یہ ہمارے سنگ فطرت کینہ جو نامہرباں
جو دلِ محنت فشاروں پر رہا ناوک فگن

یہ شبِ قاتل کہ ہر اک سانس لیتا آدمی
قبر میں سویا ہوا ہے اوڑھ کر دن کا کفن

یہ خیانت کار تاجر زندگی جو بے جھجک
بیچ دیتی ہے شریفوں کے بدن کا پیرہن

اے سوارِ رفرفِ ختمِ نبوت المدد
پھر نفس ہے سحرِ وقت کی فتنہ گری سے شعلہ زن

میں کہ ہوں ابلاغ کی قوت سے بھی کچھ بہرہ یاب
وہ شہِ منبر ہے مرے فنِ خطابت کا وطن

سوچتا یہ ہوں کہ تیرا تذکرہ کیوں کر کروں
اے کلیمِ طورِ مدحت اے مسیحِ چرخِ فن

اے کہ جس کی کفش دوزی افتخارِ بوتراب
اے کہ جس کی نازبرداری مزاجِ ذوالمنن

اے نبی اک امتی کے لب کو دے اذنِ کلام
اے نبی اس ناطقہ کو بخش یارائے سخن

تو امامِ یوسفِ جاں ہے تو میری شاعری
مصر کے بازار کی غربت زدہ اک پیرزن

ڈال دے الفاظ کے کشکول میں معنی کی بھیک
بخش دے روحِ تخیل کو فصاحت کا بدن

حرفِ کن کا سامعِ اوّل اساسِ پنجتن
نورِ مطلق، انجمن بردوش شمعِ انجمن

جس کے پروانے جلے اور جل کے زندہ ہو گئے
آج تک جن کی بقا ہے ہر فنا پر خندہ زن

وہ صریرِ کلکِ قدرت وہ سفیرِ امرِ رب
وہ ضمیرِ جسم و جوہر وہ امیرِ فکر و فن

وہ کہ جس کی فکر کے جوہر نفس اندر نفس
وہ کہ جس کی نطق کے موتی دہن اندر دہن

کیا شجر کیا جانور کیا شمس کیا نجم و قمر
کیا سمندر کیا چمن کیا دشت کیا کوہ و دمن

کیا سمائے بے نہایت کیا فضائے بیکراں
کیا زمانِ بے بضاعت کیا جہانِ پُرفتن

کیا کتابِ انفس و آفاق کیا اوراقِ عقل
کیا قلم کیا لوح کیا عرشِ علا کا بانکپن

سب ہیں اُس کی بارگاہِ قدس کے دریوزہ گر
جو عطا اندر عطا یعنی زمن اندر زمن



جبرِ غلط بخشی کے سوا کیا رکھا ہے انسان کے پاس
بادل گرجے کہساروں میں، برق گری میدان کے پاس

گھر والوں نے کل مہماں کی خاطر عزت بیچی تھی
آخر آج انھوں نے خنجر دیکھ لیا مہمان کے پاس

اپنی بقا کی جنگ میں چڑیا شہبازوں سے جیت گئی
ترکِ وطن ہی اک حربہ تھا اُس ننھی سی جان کے پاس

دل والوں میں جا کر ڈھونڈھو یک گیسری مُحکم گیری
جنسِ وفا کو ڈھونڈھ رہے ہو فتوے کی دوکان کے پاس

ہم نے چاہا تھا کہ ندیمِ دوست میں ہوئے دوست رہے
اپنی ساری غزلیں رکھ دیں غالب کے دیوان کے پاس

ہجر کی دھوپ میں صحرا صحرا برسوں دل آوارہ پھرا
نخلِ وصال کی چھاؤں ملی تو رک گیا اِک دالان کے پاس

میں دیہاتی ایک مُسافر چھوٹے سے اسٹیشن پر
ریل کی پٹڑی گھور رہا ہوں بیٹھا ہوں سامان کے پاس



تم نے بھی شاید دیکھے ہوں ایسے بھولے بھالے لوگ
نا سمجھی میں اپنے آپ کو زخمی کرنے والے لوگ

شہر نے ہم پر سنگ زنی کی ہم نے سمجھا پھول لٹے
پتھر سے کیا ڈر کر ہٹتے آگ پہ چلنے والے لوگ

وقت کی مکڑی ہر چہرے پر جالے بُنتی جائے گی
کس عنوان سے صاف کریں گے اس مکڑی کے جالے لوگ

نیزہ گری کی صنعت پہ یہ وقت بھی آنے والا تھا
اپنے سینے چھید رہے تھے نیزہ بنانے والے لوگ

ہستی کے گرداب میں پھنسے دوست بھی بکھرا جاتے ہیں
ان دیکھے رستوں پہ ملے ہیں کتنے دیکھے بھالے لوگ

سچ کے زخمی جسم پہ کتنے پھاہے ہیں افسانوں کے
کتنے پردوں سے ڈھکتے ہیں اپنی خو کے چھالے لوگ

طالب کس وحشی دنیا میں ڈھونڈتے ہو انسانوں کو
اب وہ سانچے ٹوٹ چکے ہیں جن سانچوں نے ڈھالے لوگ



دن گزرا تھا ریت کے بنجر ٹیلوں میں
آخرِ شب آ بیٹھے گھر کی فصیلوں میں

ہم نے اپنی ہستی کا ادراک کیا
دلکش جذبے کھو گئے خشک دلیلوں میں

دیکھی اک خاکسترِ دل کی شعلہ گری
لگ گئی آگ حویلی کی قندیلوں میں

باتوں پہ اجمال کا پردہ رہنے دو
زہر بھرا ہے بے مقصد تفصیلوں میں

اِک کنکر سے کتنے دائرے بنتے ہیں
کیسی بے آواز طلب ہے جھیلوں میں

اوّل اوّل علم فقط اک نقطہ تھا
آخر آخر جہل بنا تاویلوں میں

گرمی تھی اور پورا قریہ پیاسا تھا
پانی موجیں مار رہا تھا سبیلوں میں

کندھوں پر جب تک لوہے کی چھڑیاں ہیں
صُلح نہ ہوگی برسرِ جنگ قبیلوں میں

یہ مرا مشکیزۂ بے آب، صحرا اور میں
جانتے ہیں پیاس کے آداب صحرا اور میں

کیا خبر کتنا علاقہ رہزنوں کی زد میں ہے
رات بھر جاگا کیے اسباب، صحرا اور میں

چاند نکلے گا تو مٹ جائیں گے سارے فاصلے
اوڑھ لیں گے چاندنی کو خواب، صحرا اور میں

سردیوں کی رات جب بھیگی تو ٹھٹھرانے لگے
قصۂ بے مہریٔ احباب، صحرا اور میں

یہ تو میں بھی جانتا ہوں جس کا جو مقسوم ہے
ہو ہی جائے گا کبھی شاداب صحرا اور میں؟

ڈوبتے سُورج میں چمکیلے پروں کی روشنی
دُور تک اُڑتے ہوئے سُرخاب، صحرا اور میں

وہ خود اپنی گمرہی کو سجدۂ بے اختیار
چار سُو اک گرد کی محراب، صحرا اور میں

پا ہی لیں گے اپنے گم گشتہ رفیقوں کا سُراغ
جوڑ لیں ٹوٹے ہوئے اعصاب، صحرا اور میں

کر رہے ہیں زندگی میں معنویت کی تلاش
غوطہ زن ہیں فکر میں تالاب، صحرا اور میں

جو اس کی آنکھوں میں تھے فروزاں وہ سارے پیغام بجھ گئے ہیں
مرے لئے ساری بستیوں کے دیے سرِ شام بجھ گئے ہیں

خود اپنی ہی سرخوشی میں گم ہیں کم بضاعت چراغ دل کے
کہیں سرِ شام جل اٹھے ہیں کہیں سرِ شام بجھ گئے ہیں

مزاجِ آتش زنی کو کل پھر نئے گھروں کی تلاش ہو گی
جو صبح سے جل رہے تھے اب تک وہ سب در و بام بجھ گئے ہیں

جُدا ہوا جو بھی اپنے مرکز سے اُس نے اپنی شناخت کھو دی
فضا میں ٹوٹے ہوئے ستارے بھی جل کے گُم گئے وہ کام بُجھ گئے ہیں

یہ جان کر بھی سخنوروں نے چراغ روشن کیے سخن کے
جو محفلِ خاص میں جلے ہیں وہ بزمِ عالم بُجھ سکے ہیں



ہر ایک جسم میں نشیب و فراز فن تو نہیں
ترا بدن تری آواز کا بدن تو نہیں

خلافِ رسم خموشی میں مصلحت ہے ضرور
مرا حریف مری طرح کم سخن تو نہیں

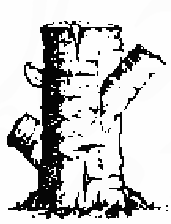
سفر ہے شرط تو کیوں ہو رہا ہے یہ احساس
کہ میری چال پہ کچھ لوگ خندہ زن تو نہیں

قدم قدم پہ فسانے ہیں چاکِ دامن کے
یہ زندگی کسی یوسف کا پیرہن تو نہیں

اتر رہی ہے مرے دل میں نوکِ خنجر سی
کہیں یہ برقِ تبسم ارادۃً تو نہیں

فریبِ ذات میں گم ہو کے خوش رہے تو رہے
خود اپنی ذات میں وہ شخص انجمن تو نہیں

جہاں طیور ترستے ہوں خوش نوائی کو
چمن کے نام پہ تہمت ہے وہ چمن تو نہیں



اے دلِ شکستہ دل مرے تو اور تری تنہائیاں
لے جاگ اُٹھی قسمت تری پاس آگئیں رسوائیاں

مٹی کی اُجڑی مانگ میں سیندور جس نے بھر دیا
اُس خون کا صدقہ ہیں یہ دنیا کی بزم آرائیاں

ہم کو شرافت کی سند دینے وہی آج آئے تھے
جن دشمنوں نے زندگی بھر ہم سے مُنہ کی کھائیاں

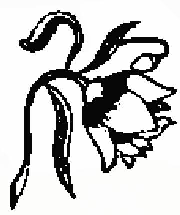
تنہائی کے لمحوں میں بھی پُرکاریوں کا بانکپن
اِک بار ملنے کے لیے سو بار بے پروائیاں

بھادوں کی جلتی دھوپ میں اُس کے قدم بُجھتے رہے
پیپل کی ٹھنڈی چھاؤں میں سوتی رہیں ہمسائیاں

ہم اُس کو آتے دیکھ کر رستے سے خود کترا گئے
نادانیوں کی اوٹ میں کام آگئیں دانائیاں

بستی سے جب ڈولی چلی کچھ دُور تک ہم بھی چلے
لیکن شکستہ فوج کا مقسوم ہیں پسپائیاں





جس چہرے کو ڈھونڈ رہا تھا دل صحراؤں میں
وہ چہرہ آسودۂ خواب تھا پیڑ کی چھاؤں میں

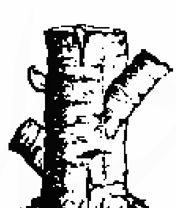
کوئی مجھے بتلائے کہ کیسے رزق کا کال پڑا
ہم جیسے انسان بسے تھے جن دنیاؤں میں

غاروں کی دیواروں پہ یہ تصویروں کا جال
بوڑھا ماضی ہانپ رہا ہے سرد گپھاؤں میں

شاید کوئی تارا ٹوٹا، جل کر راکھ ہوا
نور کی ایک لکیر سی دیکھی ہم نے فضاؤں میں

ہجرِ یار کی دھوپ میں آخر وہ بھی سوکھ گئے
یادوں کے بجرے چلتے تھے جن دریاؤں میں

وقت کی کس آواز پہ طالب میں لبیک کہوں
میرا مخاطب کون ہے ان بے مہر صداؤں میں



شام کے پنچھی بول رہے ہیں
تارے آنکھیں کھول رہے ہیں

لفظوں کے گستاخ سفینے
سطحِ زباں پر ڈول رہے ہیں

دامنِ یار ہے قیمت ان کی
آنسو کب انمول رہے ہیں

یادوں کے سیاح پرندے
اڑنے کو پر تول رہے ہیں

جس مٹکے سے پیاس بجھائی
اس میں مٹی گھول رہے ہیں

کوئی عذاب آنے والا ہے
سناٹے پھر بول رہے ہیں

لوگ مری گستاخ نگاہی
کس میزاں میں تول رہے ہیں

ہم بھی دل کے ہاتھ میں طالب
مانندِ کشکول رہے ہیں

پیاسے ذرّے ہانپ رہے تھے دشت کی سُوکھی تھالی میں
بادل کب تک ہاتھ بٹاتے مٹی کی خوشحالی میں

میری کم ظرفی پر مت جا اپنی شانِ کریمی دیکھ
ڈال دے سورج کا اِک سکّہ میرے کاسۂ خالی میں

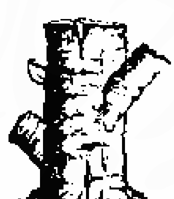
نانگا پربت کیا جانے دُکھ چولستان کے صحرا کا
پگھلی برف کی چاندی ڈالے کیوں اِک دستِ سوالی میں

کتنے دن وہ باغ پھلے گا جس کا مالی شام ڈھلے
کلیاں توڑ کے سیج سجائے آگ لگا دے ڈالی میں

چاروں اُور تھی جھوٹ کی برکھا سانچ کی آنچ ہمیں تک تھی
ہم بیساکھ کی دھوپ سے سُلگے ساون کی ہریالی میں

گلشن کے سارے دروازے آج اُسی پر بند ہوئے
جس کے لہو کی دھار رواں ہے باغ کی ڈالی ڈالی میں

ترسیلِ مفہوم کی خاطر روپ بھرا ہے شاعر کا
ورنہ کہاں کے عشق و محبت، اِس ذہنی بدحالی میں



وہ شعلے جو غرورِ آتشِ نمرود ہوتے ہیں
خود اپنے لمحۂ موجود میں مفقود ہوتے ہیں

خریدی جائیں کیا آسائشیں محنت کے سکوں سے
کہ یہ جیبِ ہنر میں رہ کے بھی بے سود ہوتے ہیں

جو اک طرزِ مسلسل ہوں شعورِ نے فروشاں پر
وہی نغمے حریفِ نغمۂ داؤد ہوتے ہیں

یہ سنگِ راہ اک مہمیز ہے عزمِ مسافر کو
کہ بڑھتی ہے طلب جب راستے مسدود ہوتے ہیں

جبیں جھکتی ہے جن کی آستانِ درِ انساں پر
وہ سجدہ کیش ہی احساس کے معبود ہوتے ہیں

رہائی کیا ملے احساسِ محرومی کے زنداں سے
کہ جذبے اپنی ہر کروٹ میں ناآسودہ ہوتے ہیں

وہ موتی بیچ نہیں سکتے غبارِ کوئے تجارت سے
جو آغوشِ صدف میں بھی غبار آلودہ ہوتے ہیں

کہیں انفاس کی گرمی سے شعلوں میں نہ ڈھل جائیں
یہ ریشم جسم اپنی ذات میں بارود ہوتے ہیں

زبان و حلق و لب کا گلستاں محدود ہے لیکن
جو نغمے اس میں کھلتے ہیں وہ لامحدود ہوتے ہیں

یہ لمحے وہ طلسمی خواب ہیں چشمِ مصور کا
کہ ناموجود ہوں پھر بھی کہیں موجود ہوتے ہیں

کہاں تک فلسفہ الفاظ کے آسیب سے بچتا
معانی ذہن کے اندر بھی حرف آلود ہوتے ہیں



کسی پیڑ کے سائے میں دھونی رما، کسی گھر میں نہ بن مہمان میاں
کوئی ٹکڑا اٹک گیا دِل میں اگر، اسی ڈنک سے جائے گی جان میاں

تمھی بولو کہ یہ وہ جگہ تو نہیں جہاں ساتھ میں کھیلا تھا اس کے کبھی
اُس وقت تو جاگتا جیتا تھا یہ اب سُونا ہے کیوں دالان میاں

کچھ لمحوں کا جبرِ رفاقت تھا نہ وہ صبر نہیں کوئی انجانا مگر
جہاں ساتھ رہے تھے گھڑی دو گھڑی یاد آتا ہے اب وہ مکان میاں

بڑے علم شناس و سخن پرور، بڑے ژرف نگاہ و ادب گستر
سرِ مقتلِ لا سبھی کہتے رہے یہ نبرد نہیں آساں میاں ۔

کبھی نحو پہ کشتی رہی فلسفے سے، کبھی علمِ کلام سے سر پھوڑا
کبھی ڈس گیا سانپ تصوف کا، کبھی چھید گیا عرفان میاں

میں فراقِ ازل میں تھا تو کسل مرے کان میں آ کے عدم نے کہا
یہ مرے ہی وجود کا آئینہ ہیں وہ مکان ہو یا کہ زمان میاں

جسے حرفِ الف نے فریب دیا اُسے جملوں کی ساخت سے ربط ہی کیا
فقط اپنی نمود کا دھوکہ ہیں یہ جو سارے ہیں نام و نشان میاں

نہیں کوئی جو مجھ کو شکار کرے ہوں خود اپنی ہی گھات میں بیٹھا ہوا
غمِ ذات کے ٹکڑوں کو چن چن کر میں تو جوڑ رہا ہوں مچان میاں

نہ میں وارث شاہ نہ میر تقی، کشکول بدست گداگر ہوں
کچھ ادھر سے لیا کچھ ادھر سے لیا، یوں ہی جمع کیا دیوان میاں

پہلا قدم

میرے مسافر سب مجھے بتاؤ
تمہارے تلووں کی سلوٹوں میں
کہاں کہاں کی
سنہری مٹی کی داستانیں چھپی ہوئی ہیں

کبھی نجف کے کتاب خانوں میں
نوجوانی کی تند راتیں گزر رہی تھیں
کبھی مضافاتِ قاہرہ میں
قریبِ اہرام سر جھکائے
تم اپنی سوچوں میں گم کھڑے تھے

کبھی تمہیں تھیمز کے کنارے
رفیقِ کہنہ کی ایک ہلکی سی بے رخی پر اداس دیکھا
کبھی تمہیں خوشگوار لمحوں میں اس کی پلکوں کے پاس دیکھا

کبھی تمہیں اقتدار کی مسندِ ہوس کے قریب پایا
کبھی تمہیں منبرِ عزا پر حسینیت کا نقیب پایا

اور آج تم اک قلم زدہ لفظ کی طرح سے
خود اپنی بستی میں بے سہارا ہو، بے اثر ہو، جلا وطن ہو
تم ایک بھولی ہوئی کتھا ہو
تم ایک قیدی ہو
اور رہائی کی شبھ گھڑی انتظار میں ہے

رہائی پاکر
جب اپنی بستی میں اپنا پہلا قدم رکھو گے
تو خواب بکھرے ہوئے ملیں گے
تمہارے بچوں کی ماں تمہیں منتظر ملے گی
کہ رزق اس کا
تمہاری قسمت سے منسلک ہے

سب جیل، گھارو ریسٹ ہاؤس

تہذیب

ہر ایک حرف کا سینہ ہے قلزمِ افکار
ہے اِک خزانہ بتوں کا ہر ایک ذرۂ سنگ

ہر ایک عنصرِ فطرت ہے غیر جانب دار
ہو رو بہ کار پئے امن یا پئے مقصدِ جنگ

زمین دے گی نمو وہ ببول ہو کہ گلاب
چلیں گے ہاتھ ہمیشہ وہ چنگ ہو کہ خدنگ

عقول فکر کریں گے خطا ہو یا کہ صواب
دماغ وضع کریں گے قلم ہو یا کہ تفنگ

کہاں نصیب کسی مسئلے کو قطعیت
کہ جب اضافتِ وقت و مکاں سے مختل ہے ڈھنگ

چٹان کاہ کی نسبت سے ایک کوہِ گراں
وہی چٹان مقابل ہیں کوہ کے پاسنگ

بلند ابر مقابل ہیں آسماں کے زمیں
وہی ابر زمیں کے مقابل ہیں آسماں آہنگ

اسی اصول پہ انساں کی اولیں تہذیب
چلی قدم بہ قدم روم و رے سے تا حدِ زنگ

حروف و صوت کی امداد باہمی کے طفیل
عطا ہوا لبِ انساں کو بول چال کا ڈھنگ

فنونِ شعر و خطابت کے روپ میں ابھری
ہجومِ عام کی زیرِ زبان و دل کی اُمنگ

اُداس رات کی تنہائیوں کو بہلانے
اُتر پڑے دلِ انساں میں نغمہ و آہنگ

بشر کی سطحِ تخیل پہ مرتعش تصویر
بنی درخت کی چھالوں پہ صفحۂ ارژنگ

طبیعت الجھی جو غاروں کے گھپ اندھیرے سے
تو اتری قلب میں تعمیرِ آشیاں کی ترنگ

کچھ اس طرح سے چلا قافلہ ثقافت کا
جلو میں اپنے لیے شمعِ دانش و فرہنگ

کہ فکر ساتھ تھی سالارِ قافلہ بن کر
حجر کے عہد سے تا عہدِ انقلابِ فرنگ

تمہارے فکر نے اقدار کی اضافت دی
کیا ہے خیمہ کو شہ اور رسل کو ڈھنگ

کبھی ہوا تھا ترازو جہاں خدنگِ نگاہ
جمی ہوئی ہے ابھی تک وہیں نگاہِ خدنگ



مٹی کا رشتہ

بوسیدہ ٹوٹی گلیوں میں
وہ اک عرصے بعد گیا تھا
جن کی ہر دیوار سے چمٹا
اس کا بچپن اُونگھ رہا تھا

وہ پہلے تو چند دنوں تک
بے مقصد گلیوں میں گھوما
دشت و دمن میں چکر کاٹے
بام و در کو آنکھ سے چوما

پھر آبائی قبرستان میں
اک دن فاتحہ پڑھنے آیا

اس کے دامن اور تلووں سے
خشک ببول کے کانٹے اُلجھے
سوکھے پیڑ کی شاخ پہ بیٹھا
اک تنہا کوا چلایا
ایک گلہری نے گھبرا کر
غور سے اس کی جانب دیکھا

آبا کی قبروں پر رک کر
اس نے گرد و پیش نظر کی
دھنسی ہوئی ٹوٹی قبروں سے

چند ننھی قبروں نے پوچھا
آنے والے پردیسی کا
اس مٹی سے رشتہ کیا ہے؟



غلاموں کے سوداگر

بے صدا، ویراں، بے رونق
مگر سرسبز ساحل کا کنارہ
ڈوبتے سورج کی کرنوں کا سلام آخریں
نہ صبح سے اب تک
نہ جانے کتنے ہم جیسے سفر بردوش

زنجبار ۔ مسافر

اپنی ہی ارضِ وطن سے عاق کردہ لوگ
ان غباروں کا سا تانا بنے ہیں
جن کو انسانی ہنر کی نادرہ کاری نے بخشا ہے وجود

شورزارِ بحر کے اتنے قریب
آبِ شیریں کا کنواں
دستِ بشر کا معجزہ

سرد بیگانی ہوا کی سنسناہٹ کے خروشاں زیر و بم میں
کپکپاتے کان وہ زخمی کراہیں سن رہے ہیں
جو کبھی حبشی کنیزوں اور غلاموں کے
اندھیرے اور یخ بستہ لبوں سے
اپنے صیادوں کے ہیبت ناک کوڑوں پر اٹھی تھیں
زنجبار اس ساحلِ ویراں کے رازوں کا امیں ہے
ایشیا والوں نے صدیوں تک جہاں سے

اپنی آسائش کی خاطر
آدمیت کی تجارت کی

یہ نڈافو میرے ماں جایوں کا خوں ہے
یہ چلو لا رہا ہے
میں تمہارا محترم مہماں ہوں لیکن
جانتے ہو تم
کہ میں بھی ایشیائی ہوں

انھیں بردہ فروشوں کا تم ہو
اک منافق اور فرومایہ تم
پہلی ہی پرواز سے تم
مجھ کو میرے ملک واپس بھیج دو

ناریل کا پانی
گھانا

مکڑی کا گھر

مکڑی کا گھر (یعنی جالا)
دنیا کا کمزور ترین اور بودا گھر ہے
انگلی کی ہلکی جنبش سے
اس کے تار و پود بکھر کر کھو جاتے ہیں
بچوں کی ننھی پھونکوں سے اڑ جاتا ہے
اتنا بے توقیر ہے وہ

چشم فلک نے یہ بھی دیکھا
ہجرت کی شب

غارِ ثور کے سمت خیمہ زن دھانے پر
دشمن اور نبی کے بیچ میں ایک سپہ تھا
دنیا کے بڑے طاقتور سے طاقتور تھا



مہدیٔ برحق°

ایک مبہم خودسری فکرِ مساواتِ بشر
پنجۂ مزدور سوئے گردنِ سرمایہ دار

ایک سرکش تجربہ محنت کشوں کی مفلسی
جو نظامِ زر کے استحصالِ پیہم کے شکار

° دنیا کو ہے اُس مہدیِ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار ـــــــ اقبال

ایک تجریدی تصورِ دین کی تصویر کا
نام پر تحقیق کے، روحِ شریعت سے فرار

ایک آوارہ انانیت خودی کا فلسفہ
ایک بوسیدہ غلط فہمی ادب کا شاہکار

اک بہیمانہ تخیل ہاؤ ہوئے انقلاب
اک گدایانہ ترنم صبحِ نو کا انتظار

ایک پژمردہ جہاں بانی طریقِ انتخاب
ایک ژولیدہ ہوس رانی خیالِ اقتدار

اک بھکاری کی صدا اقوام کی وحدت کا شور
اک اپاہج کی تعلّی قومیت کا خلفشار

ایک خائن کی ضمانت امنِ عالم کے لیے
ایک رہزن کی تمنا ارضِ کل کا اقتدار

ہم ہیں اور اتنے محاذوں پر جہادِ متصل
ہم ہیں اور اتنی بلاؤں میں ہے تیرا انتظار



عہدِ مُرادْ°

جستجو

اِک مسافر جو انگور کی سبز بیلوں کے سائے میں
کچھ دیر کو محوِ آرام ہو

ایک چوپان
جو سرو و خرمائے انجیر و زیتون تک
ہر خنک چھاؤں کے رمزِ مُبہم میں اپنے جوارح کو
کچھ ثانیوں کا
سکون بخش دے

°*millenium*

ایک گم گشتہ ناقہ
جو دشتِ تحیر میں اک باغ کو دیکھ کر
اس کے گوشے میں کچھ دیر کو جا رکے
اک کبوتر
جو اونچے محل کے کسی برج پر
اپنی اونچی اڑانوں سے تھک کر اتر جائے
اور سانس لے
جستجو اک حقیقت
سرابوں سے جو رفع کرتی رہے تشنگی کو
مگر تشنگی
اور بڑھتی رہے

میں وہ پتھر
جسے سارے معمار رد کر چکے تھے

وہی اب عمارت کی تزئین ہے

میں وہ چڑیا
کہ جو دامِ صیاد سے صاف
بچ کر نکل آئی ہے

میں وہ مشکیزۂ خشک
جس کا مقدر عجب ہے
کہ جب اس میں پانی بھرا جائے
تب اس پہ تیروں کی بارش بھی ہو

اے خداوند میرے خدا یہ زمیں
تیری شفقت سے معمور ہے
تو مجھے
اپنے آئین کا درس دیدے°
کہ میرے مسافر سرائیں اسی تیرے آئین

° زبور ۱۱۹/ ۶۴

گے گیت
گائے گئے ہیں°

کوئی مجھ سے سرگوشیاں کر رہا ہے
"جہاں موش کی جاں کنی عشرتِ گربہ ہو
اور جہاں گربۂ بے نوا لقمۂ شیر ہو
اور جہاں شیرِ نر ذوقِ صیاد کا .
صیدِ کم مایہ ہو
وہاں کوئی آئینِ حتمی نہیں"

دجلہ و نیل و جیحون و سیحون و گنگا و جمنا
سے تا
ہڈسن و رائن و ییلو و ٹیمز
اک پا بجولاں فراتِ تغیر رواں ہے

° زبور ۱۱۹/۵۴

رصد خانۂ روح میں
عقل کی شعبدہ کار افسوں طرازی نے یوں
علم و دانش میں شعبوں کی جمعیت گری کی
کہ ہر فکرِ مجہول مسند نشیں ہو گئی تختِ معلوم پر

وہ خیالات و اوہام و افکار جو
عنبر و عُود و لوبان و مُر سے مُعطّر
بلادِ عدم کے
طلسمی شبستاں
میں خوابیدہ تھے
اب مضافاتِ شہرِ حقیقت میں بیدار و رقصندہ ہیں

ماورائے طبیعت کے دانا
یہ منطق گر و فلسفی و محقق
یہ فطرت کے پروردہ نثار و شاعر

یہ فنکار و موجد

دروں طبیعت سفر کرنے والے

یہ اربابِ سائنس و علم و ہنر

تجربے کی بساطِ ابد کو بچھا کر

ازل سے جوا کھیلتے آئے ہیں

یہ مُفتامر

اگر جیت جائیں تو پھر ان کا نام و نسب

درج ہوتا ہے تاریخِ دانشوری کے فروزاں

ورق پر

اگر ہار جائیں تو گُم نام ہو کر

بکھرتے ہیں یہ دشتِ ذرات میں

ان کے اقوالِ علم آفریں سے

کتابوں، صحیفوں، جریدوں، رسالوں کے

اوراق پُر ہیں

یہ اقوالِ علم آفریں
آگہی کے یہ عفریت و ہمزاد و جن
اپنی فوجیں مرتب کیے
اسلحوں کا ذخیرہ لیے
تجربہ گاہِ دانش میں در آتے ہیں
ان کی افواج پہ
آگہی کی مجرّد حقیقت کا ہر وار خالی گیا

تشنہ لب حرف نے حرفِ سیراب سے
اس حقیقت کو پایا
کہ اضداد کا اندروں ایک ہے
یعنی ادراک ہی جہل ہے
ایسا جہلِ طلسمی
کہ جو علم و دانش کا ہم شکل ہے

علم نے باطنِ ذاتِ معلوم پر جا کے دستک بھی دی
روز و شب اپنی جانب بُلاتا رہا
وقت کی ہر اکائی پہ ہو کر سوار
اُس کو امکان کی ہر جہت میں پکارا گیا
ذاتِ معلوم کا حجرۂ صد بلا
جب کُھلا

تو یہ ظاہر ہوا
ذاتِ معلوم کا علم لا علم ہے

معرفت کے دَرو اور اُوپر اُٹھو
گیان کے پھاٹکوں اپنی گنجائشوں کو فزوں تر کرو
اُس کو آنا ہے جو آنے والے زمانے کا پندار ہے

تب لکھا جائے گا سرنوشتِ بشر میں
کہ وہ کائنات رموز و حقائق سے آگاہ ہو کر
زمیں پر ابد تک حکومت کرے

تب صنوبر کے اونچے درختوں پہ قلوپطرہ بسیرا کریں
اور گولر کی گنجان شاخوں میں مینا چہکتی رہے
جغد و بوم آشیاں ساز ہوں
اُن گھنے سبز پیڑوں میں جو
رزق برجستہ و برگزیدہ سے معمور ہیں
اور سمندر کے گہراؤ میں
مچھلیوں کے قبائل پنپتے رہیں
جنگلوں کی دوپہروں میں چوپائے سرشار و جولاں رہیں
ناریل کے درختوں کے پتّوں میں
اٹھکیلیاں کرتی اور سرسراتی ہوا
مست و رقصاں رہے

ناریل کے درختوں کی شاخوں میں
اٹکا ہوا چاند خنداں رہے

توکّل کا سفینہ بحرِ طوفاں خیز میں تنہا
رواں ہوتا ہے بسم اللہ مجریہا و مرساہا

اٹھا لنگر تو پھر کیا خوف گر طوفاں ہو سفینے کو
قدم بڑھ جائیں جرأت کے تو کیا کہسار کیا صحرا

سبک ساران ساحل اس سے گھبرائیں تو گھبرائیں
جو طوفاں خود سہارا دے تو گردابوں کی کیا پروا

ہوا شوخی کناں ہے آگہی کے بادبانوں سے
مسافر سے تمسخر کر رہا ہے جو تمنا دریا

تحیر کیوں ہو میرے اس سفر پر اہلِ دانش کو
کہ ایسے مرحلوں سے بھی گزر جاتا ہوں بے پروا

جہاں موجوں کو دکھ ہو ساحلوں کی بے نیازی پر
جہاں قدموں کو شکوہ ہو کہ ناہموار ہے صحرا

بدلتے جاتے ہیں پے بہ پے منظر نگاہوں کے
بڑی حیرت سے ان کو تک رہا ہے دیدۂ بینا

حیاتِ انساں کی تشکیل پاتی ہے جن اجزا سے
زوالِ آدمی کی خشتِ اول ہیں وہی اجزا

تمدن کیا؟ پرانی نیو پر اس دور کی اینٹیں
ثقافت کیا؟ کفِ ماضی پہ عہدِ حال کا سانچا

نسب کیا؟ اک تعلق بے نسب لوگوں کی فطرت کی
ادب کیا؟ ایک ورثہ بے ادب لوگوں کے جذبوں کا

خطابت کیا؟ نئے لفظوں میں دہرائی ہوئی باتیں
کتابت کیا؟ نئے ساغر میں اگلے وقت کی صہبا

قیادت کا تقاضا کیا؟ دلِ فرعون کی دھڑکن
امارت کی تمنا کیا؟ سرِ ابلیس کا سودا

جوانی کیا؟ رگِ امروز سے کھینچی ہوئی طاقت
بڑھاپا کیا؟ دلِ امروز کا اندیشۂ فردا

محبت کیا؟ دلوں کی بے ارادہ گرم بازاری
عداوت کیا؟ دلوں کی گرم بازاری پہ استہزا

یہ انساں کیا ہے؟ اک سوچی ہوئی شے ذہنِ انساں کی
یہ دنیا کیا ہے؟ دشتِ واہمہ میں سایۂ عنقا

اگر دامن میں لے لیتی نہ جذب و دفع کی طاقت
یہ ذرّہ دشت کی پہنائیوں میں کھو کے رہ جاتا

ہر اک انساں فنا کی موج پر بہتا ہوا تنکا
کوئی جمشید و کیخسرو کوئی اسکندر و دارا

یہ دنیا بے حقیقت بے بضاعت بے ثمر دنیا
جہاں تشنہ لبی کو آب مہنگا ہے لہو سستا

جہاں نوبت زناں ہیں بوم اپنی کامیابی پر
جہاں عزلت نشیں ہے کنجِ غم میں بلبلِ شیدا

جہاں ہر دور میں دیکھی گئی جنسِ وفا ارزاں
جہاں ہر عہد میں پایا گیا نرخِ حسد بالا

جہاں ذلت کا پیرایہ شکوہِ فکرِ فارابی
جہاں اک جنسِ بے مایہ دلیلِ بوعلی سینا

نگاہِ فلسفہ اس راز تک پہنچے تو کیا پہنچے
یہ عالم نقشِ کُن سے ہے یا جدل ہے مادیت کا

مسلط کیوں ہیں ذہنوں پر وجودیت کے اندھیارے
حقیقت ہیں کہ ہیں اوہام یہ دنیا و ما فیہا

تصادم کیوں ہے یہ نفی و ثبوت لا و الّا میں
سرِ انسانیت میں کیوں ہے یہ تشکیک کا سودا

جہاں ہونا نہ ہونا ایک ہو میزانِ خلقت میں
تو پھر کیسے وجودِ خارجی پاتی ہیں کُل اشیا

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگار کے پیچھے
کہ یہ ہنگامۂ تخلیق بے علت نہیں برپا

یکایک ذہن کی خوابیدہ وادی میں صدا گونجی
کہ کوئی نور ہے اس بزمِ کُن کی علتِ کبریٰ

یہ سنتے ہی تو عقل نے پکارا اے شہِ اسریٰ
نہ تھا کچھ تو خدا تھا اور ہوا جب کچھ تو وہ تو تھا

زمیں جب بانجھ ہو اور حبس طاری ہو فضاؤں پہ
کریں جب لوگ سیم و زر سے عقل و فہم کا سودا

زمیں کے بطنِ خیرہ تا سے پھوٹے نہ جب کونپل
شجر کی شاخ سایہ دار سے ٹوٹے نہ جب پتّا

بکے جب چند لقموں کے عوض گفتار واعظ کی
جھکے جب چند سکوں کے عوض دربار میں فتویٰ

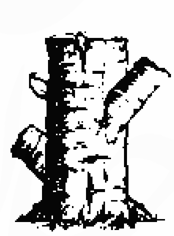
زمیں جب آدمی کے خاصے پر قحط برسائے
فلک جب ڈال دے نطقِ بشر میں خوف کا تالا

چلیں اور حالِ دل اپنا شہِ لولاک سے کہہ دیں
وہی ہے آخری حل دہر کے سارے مسائل کا

وہ آغازِ عدد، روحِ ابد، امرِ صمد جس نے
خود اپنی ذات سے توڑا عدم کا گھور سناٹا

وہ دانائے خبر، خیر البشر، صاحب نظر جس نے
بشر کی خود نگر فطرت کو بخشا دیدۂ بینا

وہ مولائے زمیں، میر المتقیں، نورِ مبیں جس نے
دیا انسانیت کو دشت آلا میں سایۂ الا



کم عمری کا دور گزارا ہم نے کس آرام کے ساتھ
اُس کا نام لکھا کرتے تھے پہروں اپنے نام کے ساتھ

شام ہی خود ہرجاتی بن کر آنکھیں پھیرے بیٹھی تھی
ورنہ یوں تو جلتے دیئے نے عہد نبھایا شام کے ساتھ

ماضی کے ہر دور میں دنیا والوں کا دستور رہا
پیغمبر سے بیر نکالا، نفرت تھی پیغام کے ساتھ

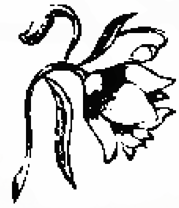
کس لکڑی کا ماضی کیسا تھا جلتا چولہا کیا جانے
اس سے پوچھو جس کا ربط ہو باغ کے قتل عام کے ساتھ

جس نے میرے دشت پہ اپنی یاد کا دریا فرش کیا
وہ بتلائے تشنہ لبی کا کیا رشتہ ہے جام کے ساتھ

ترک و طلب کا ہم دونوں میں کب سے تصادم جاری ہے
اس کا نام لیا جاتا ہے اب تک میرے نام کے ساتھ

ہم یہ پرکھیں کس کو کتنا ربط ہے اپنے باطن سے
لوگ یہ دیکھیں کس کو کتنی نسبت ہے حکام کے ساتھ

طالب تم آغاز میں خوش رہنے کی عادت اپنا لو
ایسے لوگ بہت کم ہیں جو مخلص ہوں انجام کے ساتھ



جب تو سوادِ شہرِ وفا میں ہم سفری الزام ہوئی
برسوں اس کے ساتھ پھرے ہیں تب یہ کہانی عام ہوئی

بادل بن کر بادِ صبا کے دوش پہ اڑتی پھرتی تھی
روح ہوئی جب سایۂ گل تک آئی تو زیرِ دام ہوئی

بے مقصد پرواز سے تھک کر تتلی پھول پہ بیٹھ گئی
پھول تو اپنی جان سے جاتا تتلی بھی بدنام ہوئی

نام و نسب کو اپنی گرہ میں باندھ کے ہم خوش ہیں ورنہ
ہجر سے لے کر ہجرت تک ہر جنس یہاں نیلام ہوئی

کونے کے سارے دروازے آخر مجھ پر بند ہوئے
خوف زدہ گلیوں میں تنہا پھرتے پھرتے شام ہوئی

میں نے شاید اپنی آگ میں تنہا جلنا سیکھ لیا
اس کی آگ میں جل جانے کی ہر کوشش ناکام ہوئی

گاؤں کے پس منظر میں دن بھر چیخنے والی پن چکی
میرے کل کی خاطر اپنے آج میں آرام ہوئی





بچھڑ کے اس سے امید تیرہ بخت ہو گئی
اداسیوں کی شام خود ہی ساز و رخت ہو گئی

میں روشنی کے تخم کو زمیں میں کاشت کیا کروں
فلک سے ابر چھٹ گئے زمین سخت ہو گئی

مشاہدہ کا تجربے سے کوئی ربط ہی نہ تھا
نزاعِ چشم و دل سے آگہی دو لخت ہو گئی

زمیں کے دل میں سایہ بخشنے کی جو امنگ تھی
طلب کے دشتِ بے اماں میں وہ درخت ہو گئی

شعارِ دل جب انہیں شعورِ روزگار سے
وہ زندگی ہی کب رہی جو لخت لخت ہو گئی

تمہاری بات سچ سہی، وہ نرم خو تو ہے مگر
صدائے زیرِ لب اگر کبھی کرخت ہو گئی

گدائے بے نوا ہے اپنی خواہشوں کا حکمراں
جہاں بھی تھک کے رک گیا وہ خاک تخت ہو گئی



وحشیوں کا رقص تھا یا موت کی جھنکار تھی
ڈھول کی تھاپوں سے نیزوں کی لچک بیدار تھی

شیر زخمی ہو کے مانندِ کماں خم تھا مگر
اسلحوں کی زد پہ زخمی شیر کی تلوار تھی

وہ عمارت سربلندی میں تھی آپ اپنی مثال
زلزلہ آیا تو چھت سے صحن تک مسمار تھی

وہ جو اک سقراط جامِ زہر پی کر مر گیا
موت اُس کی زیست کا سب سے بڑا اظہار تھی

کتنی بے آزار ہے دن میں نیستاں کی فضا
شب کی تاریکی میں لیکن کتنی پُر اسرار تھی

روک رکھا تھا اُسے میری نوا کے سوز نے
کونج پچھلے دن سے اُڑنے کے لیے تیار تھی

وہ کلی جس وقت اپنے کُنج میں تھی محوِ خواب
عین اُسی لمحے مرے بستر پہ وہ بیدار تھی

اس کی فطرت کا کوئی رُخ مجھ سے پوشیدہ نہ تھا
اک نئے اسرار کی خواہش پسِ اسرار تھی

کیا غرق ہونے کا گلہ دریائے بے پایاب سے
گہرائیوں کی تھاہ کا رشتہ ہے سطحِ آب سے

خوش فہمیوں کی روز و شب اور تہہ بہ تہہ نیرنگیاں
ہیں خواب میں جاگے ہوئے جو جاگ اٹھے ہیں خواب سے

بجھتا ستارہ صبح کا دیکھا کیا میری طرح
اک خوابِ شیریں کی ادا اک دیدۂ بے خواب سے

° ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

فطرت میں جس کے آب کی جولاں ہے عالمِ رقص کا
وہ بھی بگولے ہی تو ہیں بنتے ہیں جو گرداب سے

ہم بھی لیے بیٹھے رہے مہتاب کو آغوش میں
کارِ جنوں مشکل تو تھا نازک اعصاب سے

اُس کی عطا کاسہ بھی ہے اُس کا کرم کیسہ بھی ہے
لے لو جو مل جائے تمہیں بے سلسلۂ اسباب سے

اُن کے پروں کی خستگی لے آئی تھی نیچے انہیں
طالبؔ مجھے شکوہ نہیں بے مہریِ احباب سے





بہہ گئے وقت کے دھارے میں پیر ظلِ الٰہی کے
پٹ گئے سارے ہی مہرے، دیکھ بساطِ شاہی کے

کالی رات کے جنگل میں دشمن دل کی گھات میں تھا
دل نے کیا کیا لطف لیے، اس گم کردہ راہی کے

خوش اندام فرشتوں نے ہم پر کیوں الزام دھرا
ہم ہی اکیلے مجرم تھے کیا گستاخ نگاہی کے

دل کی بندرگاہ پہ بھی قزاقوں کا راج ہوا
گرد و پیش ظاہر ہیں سب آثار تباہی کے

ہم اُس کی اُمت میں سہی پھر بھی اُس سے کیا نسبت
وہ سرتاج گواہوں کا، ہم محتاج گواہی کے

اک ٹوٹے نیزے کے سوا کچھ بھی اُس کے پاس نہ تھا
پھر بھی فوجیں بھاگ گئیں تیور دیکھ سپاہی کے

دور افتادہ قصبے میں طالب ہم آباد ہوئے
ڈرے ہوئے تہذیبوں سے، ڈسے ہوئے آگاہی کے



میں دیارِ ستاروں کا ایک تنہا اجنبی
ڈھونڈنے نکلا ہوں خود اپنے ہی جیسا اجنبی

آشناؤں سے سوالِ آشنائی کر کے دیکھ
پھر پتہ چل جائے گا ہے کون کتنا اجنبی

ڈوبتے ملاح تنکوں سے مدد مانگا کئے
کشتیاں ڈوبیں تو تھی ہر موجِ دریا اجنبی

کل جو مجھ کو عافیت کی بھیک دینے آئے تھے
کس سے پوچھوں کون تھے وہ آشنا یا اجنبی

بے مروت شہریوں نے فاصلے کم کر دیئے
ورنہ پہلے شہر کو لگتا تھا صحرا اجنبی

یہ منافق روپ کب سے میری فطرت بن گیا
میرے پیکر سے ہے کیوں میرا سراپا اجنبی





وہ تارا جو رات کو اپنی روشنیاں خیرات کرے
دن نکلے تو منہ کو چھپا کر سورج کا اثبات کرے

ذات کے آئینے میں کتنے عکس خود اپنی ذات کے ہیں
اک چہرہ بیزار ہو سب سے دوسرا چہرہ بات کرے

شام ڈھلے منہ ڈھانپ کے سونا سورج کی مجبوری ہے
اپنی خوشی سے کون یہ چاہے اُجلے دن کو رات کرے

آبادی کی کوکھ سے کونپل پھوٹنے کی ویرانوں کی
لاکھ زمانہ کروٹ بدلے، لاکھ تمدن گھات کرے

کس کو خبر تھی اس جھل تھل کی آنکھ پہ یہ وقت آنا تھا
ماضی کے ہر موڑ پہ رک کر اشکوں کی برسات کرے

جسم کی خیمہ گاہ میں کتنے ہمزادوں کا ڈیرہ ہے
ایک اکیلی روح کہاں تک ان میں بسر اوقات کرے



خلوتِ بے نشاں میں پھول کھلے نشان کے
وحشتِ دل بھی سو گئی چادرِ یاد تان کے

اپنے لباسِ جاں پہ بھی صاحبو! اک نظر کرو
تکتے رہو گے کب تلک ہم کو غریب جان کے

ربطِ وجود و ماہیت ایک خلا پس خلا
مرحمتِ یقین سے پھر گئے دن گمان کے

خلوتیانِ کنجِ ہوش تشنہ لبانِ یم بہ دوش
میرے حریف تھے مگر لوگ تھے آن بان کے

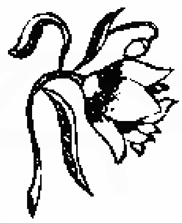
موج بہ موج یم بہ یم بادِ مُراد ساتھ تھی
ناؤ سے رو نہ ہو سکے فیصلے بادبان کے

قحطِ نمو کی فصل تھی سارے چمن خزاں کے تھے
بند تھے تمام در گنبدِ آسمان کے

تیری گلی میں خاک کر ہم نے بھی جگ بتائے ہیں
ہم پہ بھی فاش ہوں کبھی رنگ کے مکان کے

بے طلبی کی چھاؤں میں بیٹھ رہیں گے دو گھڑی
ہم نے ستون گرا دیئے اپنے ہی سائبان کے

کیا وہ نگارِ رنگ و بو گاؤں سے کوچ کر گئی
گنگ ہے نیم کا درخت خشک ہیں کھیت دھان کے



یوں شبِ وداعِ دوست آئی اور گزر گئی
دشمنی کی ہر بلا دوستی کے سر گئی

جنگلوں کی رات تھی اور میں سفر میں تھا
بھیڑیوں کے غول تھے جس طرف نظر گئی

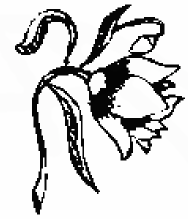
زندگی کے روز و شب فاختہ مزاج ہیں
اِک منڈیر سے اُڑی اِک منڈیر پر گئی

وقت اور روشنی ساتھ ساتھ آئے تھے
وقت تو گزر گیا روشنی ٹھہر گئی

اک شکستہ ناؤ پر ٹھہر کے بہاؤ پر
چلی تھی ڈوبنے پھر بھی پار اتر گئی

طالب آسمان پر اک ستارہ چونک اٹھا
جو امید زندہ تھی آج وہ بھی مر گئی





جن کو سچائی کی خاطر سن وارے
دور بدلا تو وہی لوگ گنہ گارے

عشق ہر دور کے اِنساں کا سماجی حق ہے
اُس میں جُرأت ہے تو ہے سرِ بازارے

اُس کے ماتھے پہ اگر ہو نہ حیا کا آنچل
اُس کے اِصرار میں کیوں لرزش نکلے

ڈھونڈنا چاہے تو اس شہر کے ہر کوچے میں
ہمتِ خضر کو گرتی ہوئی دیوار ملے

فصلِ گرما کی وہ شب اور ترے آنگن کا سکوت
چاندنی میں بھی تری نیند کے آثار ملے

لوگ اس طرح سے ملتے ہیں سرِ کوچۂ رزق
بڑھ کے تلوار سے جیسے کوئی تلوار ملے

ہم ہی کترا گئے پندارِ انا سے طالبؔ
یوں تو ملنے کو وہ خلوت میں کئی بار ملے



مرے خانہ بدوش ارماں کو اپنا گھر دیا جس نے
یہ وُہ دل ہے اندھیری رات میں بستر دیا جس نے

زمیں کی فطرتِ تیرہ کا اُس کو علم تو ہو گا
ہیولوں کو عدم کے زیست کا پیکر دیا جس نے

وُہ اپنی فطرتِ بے مہر کو سمجھا نہ تھا شاید
جبینوں کو عبادت کے لیے پتھر دیا جس نے

یہ دنیا کہ تضاد آمیز رجحانوں کی بستی ہے
وہ خود اک پھول تھا کانٹوں سے دامن بھر دیا جس نے

وہی اس عہد کا سب سے بڑا دردآشنا ٹھہرا
مرے سر کے لیے پتھر کو سنگ در دیا جس نے

وہی ہر دور کا سب سے بڑا قزاق ہے طالب
دماغ شاہ کو منصوبہ لشکر دیا جس نے





تنہا کب ہوں میرا مقدر ساتھ میں ہے
ایک ہزیمت خوردہ لشکر ساتھ میں ہے

شہر بسانے والوں کی مجبوری تھی
اپنے پرائے، دونوں کا گھر ساتھ میں ہے

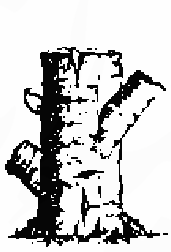
بُت شکنی انجام ہے ہر بت سازی کا
ذکرِ خلیل و شہرتِ آذر ساتھ میں ہے

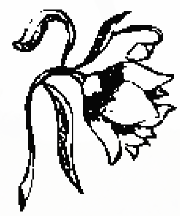
کس کا دامن تھاموں کس کو ترک کروں
اک شیطان اور ایک پیمبر ساتھ میں ہے

دھیرے دھیرے خشکی بھی دم توڑ گئی
ہم ہیں اور بے انت سمندر ساتھ میں ہے

اب ملاح ستارہ کیسے دیکھیں گے
گہرے ابر کی موٹی چادر ساتھ میں ہے

طالبؔ جس کو پچھلے نگر میں چھوڑا تھا
اُس کا تصوّر سایہ بن کر ساتھ میں ہے





کبھی کسی سے اگر حرفِ مدعا کہیے
تو سوچتا ہوں کہ اس مرحلے پہ کیا کہیے

طنابِ خیمۂ جاں کٹ کے گر گئی آخر
وفائے یار کے خنجر کو مرحبا کہیے

برس رہا ہے جو دریاؤں پر سحابِ کرم
اس انتخاب کو نیکی کا فلسفہ کہیے

وہ مجھ پہ فاش ہوا کُھلی کتاب کی طرح
اِس اتفاق کو ذوقِ مطالعہ کہیے

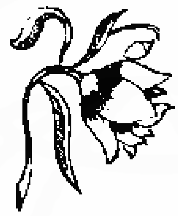
کبھی شکایتِ چشمِ کم آشنا لکھیے
کبھی حکایتِ زُلفِ ابد رسا کہیے

ہر ایک حرف کو اِک تخمِ بے نمُو لکھیے
ہر ایک شعر کو اِک حرفِ نارسا کہیے

اُڑان بھر کے چلی تھی کہ پر ہی توڑ دیے
ہوائے حبس کی اس دشمنی کو کیا کہیے

ہوا ہے تُند تو پھر سا حلی علاقوں سے
سمندروں کی شجاعت کا ماجرا کہیے

کھڑی ہوئی ہیں انا کی فصیل پر فوجیں
جو رن پڑے تو غنیمت کو خوں بہا کہیے



دل کسی منزل کو پالینے کی خواہش کیا کرے
کھیت ہی جب کم زراعت ہوں تو بارش کیا کرے

جب زمینوں پر گراتی ہو زمینداری کی برق
جو کے چھلکوں کی سنہری دھوپ تابش کیا کرے

یہ ستارے بیچ دیتے ہیں خود اپنی روشنی
پرتوِ خورشید ان کے حق میں کاوش کیا کرے

شہر مادر زاد اندھوں کی نمائش گاہ ہے
چشم بینا اپنے جوہر کی نمائش کیا کرے

گردشِ زر اک ضرورت ہی سہی انسان کی
اک گدا کاسہ گم گشتہ گردش کیا کرے

آگہی آغاز سے خود اپنے ہی نرغے میں ہے
جہل سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کیا کرے

جب زیاں پر چل رہا ہو کاروبارِ زندگی
بھوک آدم خور قوموں سے گزارش کیا کرے





سنا کے قید میں احوال راہگیروں کے
ہوا نے کھول دیے دست و پا اسیروں کے

کوئی سخی نظر آتا تو ہاتھ پھیلاتے
اس انتظار میں دن کٹ گئے فقیروں کے

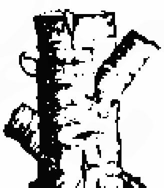
وہ گفتگو میں چھپی مصلحت کی پرچھائیں
وہ وعدہ ملنے کا انداز ہیں سفیروں کے

دلِ حریص نہ چھوڑے مگر بقدرِ ضمیر
نچے گا کیسۂ زر ہاتھ میں امیروں کے

ہتھیلیوں پہ اُگی ہے سیاہ رات کی فصل
وہ کیا گیا کہ دیے بجھ گئے لکیروں کے

خود اپنے شہر میں اب شہریار کیسے ہیں
کھنچا تو ٹوٹ گیا حوصلے وزیروں کے

مسافتوں کے کنویں جھانکتے پھرو طالب
کہ قحطِ آب ہے حجرے میں گوشہ گیروں کے





طیارے کے سارے مسافر رات کو بھی بیدار ملے
نیند کی دیوی کیا اُترے جب جسم ناہموار ملے

چوٹ لگی اک دوست کے دل کو آنکھیں اپنی بھر آئیں
ایک پُرانی یاد کے کارن درد کے کیا آزار ملے

غور سے دیکھو جسم زباں کی ہر دیوار میں رخنہ ہے
یہ مت کہنا بستی میں ہمسائے بے کردار ملے

وحشتِ دل پر صبر کا نسخہ سب نے ہی تجویز کیا
جب پڑھا تو نسخے لکھنے والے ہی بیمار ملے

کل ہم نے جس ٹیلے پر گھر کی بنیادیں رکھ دی تھیں
اس کے نیچے ایک پرانی بستی کے آثار ملے

قسمت کی یہ نیرنگی بھی کیسے روپ دکھاتی ہے
سندھ کے اک دیہات میں بچھڑے سات سمندر پار ملے

ایک کنویں کی گہرائی سے مصر کے تختِ شاہی تک
دیکھنے والی آنکھ کو کتنے نادیدہ بازار ملے

ہم بھی بکنا چاہ رہے ہیں تھوڑے سے سکوں کے عوض
جنسِ ہنر کو خریدنے والا کوئی تو دنیا دار ملے

دشتِ خیال میں بادل اُمڈے شاخِ بیاں پر پھول کھلے
طالب آج مرے جذبوں کو کاش لبِ اظہار ملے

جانور بھی قدرت کے محکوم ہیں ہر شکاری کی قسمت پہ واں سے گئے
وہ کہ جنگلوں میں جا کر چھپے تھے جو پچھلے درختوں میں ہات سے گئے

تھی آباد و ویران تھی یہ زمیں تھے سمندر جہاں میں ڈوب سب گئے
سو خدا نے اجاڑ سے ہو جا کہا اور پھر جو زمیں پر تھا سب گئے

میں کہ اب بھی خلافت کا حقدار تھا خود مشیت کی تھی میری جانب نظر
جو تقاضا قدرت کے فرامین تھے میری نظروں سے وہ سب گزر گئے

ہم حقوق و فرائض سے آگاہ ہیں جانتے ہیں کہ حق کیا ہے اور فرض کیا
وہ سنے یا نہ سننے کا حیلہ کرے ہم مسلسل اُسے ہی پکارے گئے

بس یہ معلوم ہے اس سمندر سے ہم سیپیاں اور گھونگھے ہی چنتے رہے
یہ نہ مجھ کو خبر ہے نہ تجھ کو پتہ ہم کہاں تک کنارے کنارے گئے

سارے ہی زائچے بے اثر ہو گئے اپنے بازو پہ اب تم بھروسہ کرو
جن کے ہاتھوں میں تقدیر کی باگ تھی اُن نکلتے ہی وہ سب ستارے گئے



منواتی ہے سماج کا رتبہ یہ دنیا افراد سے پہلے
ملتا ہے شاگردوں کو منصب تربیت استاد سے پہلے

گنتی سے گئے گورکھ دھندے میں خود شناسی کھیل نہیں ہے
صفر کہ اک موجود عدم ہے جب تک ہے اعداد سے پہلے

وقت نے میری ہی محنت سے اپنی ساکھ بنائی ورنہ
اس کا اتنا نرخ کہاں تھا پیسے کی ایجاد سے پہلے

میں نے مانا میرے گرز و تیغ و تبر سب پتھر کے تھے
میں نے اپنی جنگ لڑی تھی جب عہدِ فولاد سے پہلے

ہم دریا ہی ست پہنچے تھے اس طوفان بکف دریا تک
ہم تیری ہی یاد میں گم تھے، جاناں، تیری یاد سے پہلے

آنے والے کل میں اس ویران کرے پر کون بسے گا
ماضی میں تو جن بستے تھے نسلِ آدم زاد سے پہلے

مجھ کو پتہ ہے تم اپنی ذاتی جنت تعمیر کرو گے
اس میں کیا کیا رنگ بھرو گے پوچھ تو لو شداد سے پہلے

بیچ کے اپنے شعر و ہنر کو حرمتِ حرف سے کھیل رہے ہو
طالبؔ تم بے نام و نشاں تھے ابجد کی امداد سے پہلے



خواب کا خیمہ تھا اور ہم مرمریں بانہوں میں تھے
یہ وہی ہم ہیں کہ جب جاگے تو خرگاہوں میں تھے

وقت کی پگڈنڈیوں سے بستیوں تک آ گئے
ہم ابھی کچھ دن پہلے تک چراگاہوں میں تھے

دیکھتے ہو جن کو خستہ مقبروں کی شکل میں
یہ بشر تھے اور ماضی کے شہنشاہوں میں تھے

خاک کی فطرت میں عیاری کے جتنے روپ تھے
وہ جبلت بن کے شاہوں کے بہی خواہوں میں تھے

شیر کے بچے تھے گو نسلی توارث کے امیں
لیکن اپنی مصلحت کوشی سے روباہوں میں تھے

قحط کے موسم میں اپنے ہی مویشی کھا گئے
سچ تو یہ ہے وہ گرسنہ لوگ چرواہوں میں تھے

تندیِ ردِ عمل سے بے بصیرت آدمی
حجرۂ الحاد سے نکلے تو درگاہوں میں تھے

باوجودِ حرفِ استدلال کھلتا ہی نہیں
ہم کہ گمراہوں میں ہیں یا ہم کہ گمراہوں میں تھے

میں چن رہا تھا اداس لمحے خود اپنی پچھلی کہانیوں کے
سو اپنے ماضی کی رہگزر پر نشاں ملے بے نشانیوں کے

حسین و گلرنگ خوابگاہوں کے بیش قیمت کواڑ کھولیں
کوئی بتا دے یہ رانیوں کو کہ دن گئے اب راجدھانیوں کے

سفر کرو گے تو مختلف رنگ کے سمندر تمہیں ملیں گے
تفاوتِ رنگ پر نہ جانا مزاج یکساں ہیں پانیوں کے

فراز منبر وطن ہے اپنا تو دین ہے اس سخن کی ورنہ
ہم ایسے الفاظ کے گداگر حریف ہیں خوش بیانیوں کے

یہ اس کی عادت ہے ڈھیل دے کر پتنگ کی ڈور کھینچ لینا
وہ بدگماں ہو تو پھر بناتا ہے دائرے بدگمانیوں کے

رموز فطرت کا داستاں گو شکار ہے کم بضاعتی کا
نئی کہانی میں ٹانکتا ہے پرانے ٹکڑے کہانیوں کے

وہ مہرباں ساعتوں کی یادیں تھیں جب ہم بہم ہوئے تھے
اور آج صحرا میں جیسے بکھرے ہیں قصے ٹوٹے مہربانیوں کے





آج بھی آپ گئے تھے ملنے اس کے گھر، پھر نکل جائیں گے
طالب صاحب آگ سے مت کھیلیں، بالآخر جل جائیں گے

وہ اپنے گھر کی رونق بن جائے تو ہم وعدہ کرتے ہیں
اپنے گھر واپس جا کر گھر کے ماحول میں ڈھل جائیں گے

بستی جل گئی لیکن اس کے دل شعلوں پر خندہ زن ہیں
جب خاکستر بن کے اڑے گی تب بستی کے دل جائیں گے

حدِ نظر تک خشخاش کے نیلے پودے تھے اور میں تھا
دل نے کہا تھا آنکھ جھکا لے ورنہ پودے جل جائیں گے

دولت پر اترانے والے اپنا آپ بچا کر رکھیں
یہ تیزاب ہے اس میں گر کر ہیرے گوہر گل جائیں گے

اپنی مہار کو خود ہی تھامے ایک چھلاوے کے پیچھے ہم
جنگل جنگل گھوم چکے ہیں اب بادل بادل جائیں گے

ذہن کے سب کھڑکی دروازے کھول کے اندر جھاڑو دے دو
کب سے ذخیرہ پڑا ہے اس میں بچھو پل جائیں گے

اس سندر دیوی کو شاید مجھ سے کوئی کام نہیں اب
اب پھر سارے عہد و پیماں اگلے جنم پہ ٹل جائیں گے

اس نے مجھ سے عذر تراشے یعنی وہ یہ جان رہا تھا
ایک یہی دکان ہے جس پر کھوٹے سکّے چل جائیں گے

جب خدا اٹھ پائے بندگی کے شانوں سے
دل تراش لاتا ہے کوئی بت چٹانوں سے

یوں بھی روٹھ جاتی ہیں بدلیاں کسانوں سے
ٹوٹ کر برستی ہے آگ آسمانوں سے

کشتیاں سر ساحل کھا رہی ہیں ہچکولے
سرپھری ہواؤں کو ضد ہے بادبانوں سے

ناوکوں کو ترکش پہ کیسے اعتبار آئے
جب خراج لیتی ہوں چٹکیاں کمانوں سے

راستے میں ناقوں نے جو عذاب جھیلے ہیں
وہ بھی پوچھتا کوئی جا کے ساربانوں سے

آسماں کی وسعت میں کانپتے ہوئے تارے
ٹوٹ کر گرے ہوں گے وقت کی چٹانوں سے

کھلی فضاؤں میں دن گزارنے والے
تھک کے گر پڑے آخر تند و تیز اڑانوں سے

ذہن و عقل مشرک ہوں تم کو اس کی کیا پروا
جوڑتے رہو اپنا سلسلہ اذانوں سے

آ گئیں کیا مسافر تک اب ہوائیں منزل کی
ہو گئے ہیں آزردہ راستے مکانوں سے

ہم بھی ایک اندھے تھے شہرِ فکر میں طالب
سنگ ریزے چن لائے بیکراں خزانوں سے



کون بے سبب کسی پر اسلحے اٹھاتا ہے
یہ بھی میرا دشمن دوستی کا ناتا ہے

سر بریدہ لاشوں پر پڑ رہے ہوں جب خنجر
آئینوں کے مقتل میں سنگ دف بجاتا ہے

جس طرف نظر اٹھی مجھ کو میں نظر آیا
میں جو مجھ کو ہر رخ سے آئینے دکھاتا ہے

ایک ہی کہانی ہے قصہ گو کے کیسہ میں
قصہ گو کے لہجوں سے رُخ بدلتا جاتا ہے

کانچ کے کھلونوں پر اعتبار کیا کرنا
وہ بھی ٹوٹ جاتے ہیں جو خُدا بناتا ہے

بس اسی پہ سجتی ہے ذات کی مہم جوئی
جو مزاجِ امکاں کا صبر آزماتا ہے

جاگتی ہے ماتھے پر جب تھکن لکیروں کی
عرصۂ مصیبت میں درد مُسکراتا ہے

اَن کہی رفاقت ہے مجھ میں اور مرے دِل میں
میں بھی ڈوب جاتا ہوں وہ بھی ڈوب جاتا ہے

دھوپ جب تک سر پہ تھی زیرِ قدم پائے گئے
ڈوبتے سورج میں کتنی دور تک سائے گئے

آج بھی حرفِ تسلی ہے شکستِ دل پہ طنز
کتنے جملے ہیں جو ہر موقع پہ دہرائے گئے

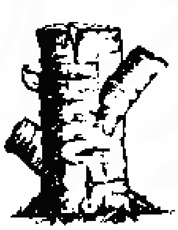
اس زمینِ سخت کا اب کھودنا بیکار ہے
دفن تھے جو اس خرابے میں وہ سرمائے گئے

دشمنوں کی تنگ ظرفی ناپنے کے واسطے
ہم شکستوں پر شکستیں عمر بھر کھاتے گئے

اب درندہ کھوجیوں کی دسترس میں آ گیا
نہر کے ساحل پہ پنجوں کے نشاں پائے گئے

آج سے میں اپنے ہر اقدام میں آزاد ہوں
جھانکتے تھے جو مرے گھر میں وہ ہمسائے گئے

اِن گلی کوچوں میں بہنوں کا محافظ کون ہے
کسبِ زر کی دوڑ میں بستی سے نکل جائے گئے



دیارِ حُسن میں تجدیدِ عاشقی کے لیے
ہم ایسے لوگ ضروری ہیں ہر صدی کے لیے

اُس امتحاں میں بھی اک لذّت گوارا ہے
وہ امتحاں جو بڑا سخت ہے کلی کے لیے

بنامِ زہرہ جبیناں جگر کو خون کرو
لہو جلاؤ ہزاروں کی روشنی کے لیے

گھٹے تو جہلِ مرکب بڑھے تو کربِ حیات
یہ آگہی بھی مصیبت ہے آدمی کے لیے

کنارِ نہر بنفشے کی جھاڑیوں کے قریب
وہ سوگوار کھڑی تھی اک اجنبی کے لیے



اس کی خوشی سے بزم میں آنا اس کی خوشی اٹھ کر جانا
دونوں عمل ہیں غیر ارادی، پیدا ہونا مر جانا

ذوقؔ کے اِک مطلع کو ہم نے آج کا لہجہ بخشا ہے
کچھ نے اسے سرقہ گردانا کچھ نے نئے تیور جانا

بستی کے اِک چوک پہ رہرو دل کی پونجی ہار گیا
کس نے اس کے درد کو سمجھا سب نے سوداگر جانا

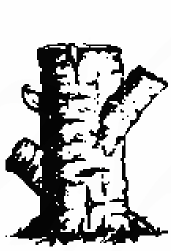
اپنی ہستی نفی و ثبوت کے دو رستوں کا سنگم ہے
اِک خنجر سے جان بچانا اِک خنجر سے مر جانا

جانِ تمنا جس میلے میں جان کی بازی لگتی ہو
اس میلے سے جان بچا کر سیدھے اپنے گھر جانا

موسمِ وصل کے سارے شیریں لمحے زہر آلود ہوئے
شہرِ فراق سے قاصد آیا عقل نے پیغمبر جانا

ڈول کنویں میں ڈال کے پانی کھینچنے والے پردیسی
پیاس بجھا کر بیٹھ نہ جانا گاؤں سے ہجرت کر جانا

رات بھری محفل میں طالب ایک ہی دکھ تھا دونوں کا
اُس کو اپنے گھر جانا تھا مجھ کو اپنے گھر جانا





ہم نے خطابت کیا اپنائی بزمِ نگاراں دُور ہوئی
نام تو پہلے سے مشہور تھا صورت بھی مشہور ہوئی

بستی بستی گھوم رہا ہوں اب بھی وہی درخواست لیے
وہ درخواست جو ہر دفتر میں یکساں نامنظور ہوئی

عطر فروشوں کے کوچے میں ایک شناسا خوشبو نے
میرا دامن تھام لیا تھا اتنی دیر ضرور ہوئی

اُس نے جب بچپن سے نکل کر بامِ شباب پہ پاؤں دھرا
کانچ کی گڑیا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کے چکنا چور ہوئی

کشتی کے سوراخ پہ جس دن ایک پیمبر چونکا تھا
اُس دن سے کشتی کی حفاظت موجوں کا دستور ہوئی

مُلکِ سبا سے ایک پرندہ قاصد بن کر آیا تھا
لفظ بدل کر وہی کہانی کہاں کہاں مذکور ہوئی

طالب صاحب آپ کے لہجے کا دھیما پن کہتا ہے
پچھلے برس جو چوٹ لگی تھی آج وہ جزوِ شعور ہوئی



طالب تم نے کس کی خاطر جی کو روگ لگایا ہے
ایک تمہیں پر دھوپ ہے اس کی، دنیا بھر پر سایا ہے

ٹکراتی ہیں سوچ کی موجیں جب بھی ذات کے ساحل سے
نقش ہوا ہو جاتا ہے ذاکر نے جو فرمایا ہے

صبح بہاراں تھی جب دل کو ایک محل میں کھویا تھا
شام خزاں ہے اور اسی کو ایک کھنڈر میں پایا ہے

شام فراق کے تنہا تارے بس اتنا بتلاتا جا
مجھ سے بچھڑ کر کیا وہ بھی میری ہی طرح پچھتایا ہے

دکھ سکھ کے انداز الگ ہیں اپنا بیری کوئی نہیں
ہم نے اس کے قول قسم پر جان کے دھوکا کھایا ہے

جس چھتے کو توڑ رہے ہو اس میں شہد کی مکھی نے
صحرا صحرا جنگل جنگل پھر کر شہد بنایا ہے

کل تک اس نے وہم کہا تھا خوابوں کی ماہیت کو
آج وہ مجھ سے خوابوں کی تعبیریں پوچھنے آیا ہے

دھوپ اتری تھی آنگن میں اور دیواروں پر سایا تھا
دھوپ چڑھی ہے دیواروں پر اور آنگن میں سایا ہے

رمزِ وجود

اسرارِ نہاں میں گم حویلی
پھیلی ہوئی صحن میں چنبیلی

لپٹے ہوئے بام و در سے جالے
ماضی کی شکست کے حوالے

اُکھڑی ہوئی اینٹ جا بجا کی
ہے شکوہ کناں غرورِ پا کی

گزری ہوئی کل کی چشمِ بیدار
بے ربطیٔ خواب جھیلتی ہے
لمحوں کو ارم بنانے والی
صدیوں کے عذاب جھیلتی ہے
اک عارضہ زہر پی چکا ہے
اک پیاسِ سراب جھیلتی ہے

اسرارِ نہاں کی رہ گزر میں
یا کیسۂ جاں کے نقدِ زر میں

کچھ وحشتِ قلبِ دل فگاراں
کچھ رونقِ بزمِ رازداراں
کچھ کربِ نوائے سوگواراں
کچھ شامِ وداعِ گل عذاراں

بے آب و نمک ہے موجِ خوں کی
اک یاد ہے بخیہ گر جنوں کی

خاموش ہے دلبری کا انداز
ٹوٹا ہوا پیار سرنگوں ہے
بجتا ہے خزاں کا دف چمن میں
پھولوں کی بہار سرنگوں ہے
اب بانگِ حُدی نہ شورِ ناقہ
صحرا کی پکار سرنگوں ہے
خاموش ہے گھنٹیوں کی آواز
اونٹوں کی قطار سرنگوں ہے

لے کر غمِ ذات کی سواری
اوجھل ہوئی عقل کی عماری
اک کرب ہے ناطقہ پہ طاری
گزرے گی عدم کی رات بھاری

اژدہاں میں سانپ سرسرائے
اُلجھے روشِ خرد پہ سائے

ڈوبیں جب فضا کی نبضیں
ڈوبے افقِ قدر پہ تارے
تشکیک کے بحرِ بیکراں میں
ایقان کو مل گئے کنارے

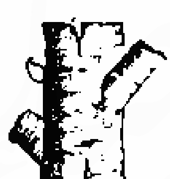
از ذرّہ بے شعورِ گیتی
تا گوش و کنارِ آسماں ہا
از کلفتِ ناوکِ جراحت
تا عسرتِ ترکشِ کماں ہا
از محضرِ قتلِ بے نوائی
تا دفترِ بے نوائے جاں ہا
از ذوقِ کشودِ بے زبانی
تا شوقِ نمودِ بے زباں ہا

(خود اپنی شناخت سے تہی ہے
ہر محضرِ اسم ہائے اشیا

پروردۂ احتیاج العباد

ہر مظہر جسم ہائے اشیا
آغاز کہ شے بہ فیض لاشے
انجام طلسم ہائے اشیا
زندانی حقیقت و ارادہ
شیرازۂ قسم ہائے اشیا)

ہر شے ہے سرابِ خود پرستی
"ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے"
لاشے بھی حریفِ شے نہیں ہے



اِنکشاف

مَیں جانتا ہُوں
کہ بے نہایت کی سرحدوں پر
وجُود و موجُود کی نہایت پہ شکوہ سنجاں
ہزار ہا قرن ہائے نُوری
کے طُول میں
تا حُدُودِ اِمکاں

میں سر بہ سجدہ پڑا رہا ہوں

بہ قولِ توریت

کچھ دنوں جنتِ عدن کی عطوفت آگیں

فضاؤں میں کھیلتا رہا ہوں

(کتابِ تکوین: بابِ اوّل)

میں اپنے شانوں پہ اپنا زادِ سفر سمیٹے

نہ جانے کب سے

زمیں نوردی کے شوق میں مبتلا رہا ہوں

فرات و دجلہ کی وادیوں میں

بشر کی تہذیبِ اوّلیں کی کتھا رہا ہوں

بہ قولِ قرآن

(سورۂ نازعات کی آیتِ گرامی)

میں عہدِ ماضی کی داہمہ ساز آبنوسی

سیاہ و شب زاد

بستیوں میں

بہت دنوں تک خدا رہا ہوں
کنارِ گنگ و جمن میں
پتھر تراش کر پوجتا رہا ہوں
میں ہر زمانے میں ہر زمیں پر
حرم سراؤں میں نغمگی کی چتا رہا ہوں
میں تاجداروں کے طبل و نقارہ و علم
کی سلامتی کا
نشان بن کر
غنیم کے حوصلوں سے جنگ آزما رہا ہوں
بلائیں، آفات، قحط، امراض، زلزلے،
رعد و برق و باراں
ہر ایک سے آشنا رہا ہوں
اور آج یہ منکشف ہوا ہے
کہ بیل ہوں میں کسی رہٹ کا

میں کشتِ ویراں کی آبیاری کے واسطے
ایک دائرے میں
ازل ابد
گھومتا رہا ہوں



حتمیّت

اس نے کہا یہ دنیا پیہم شانِ تغیر رکھتی ہے
پھول گرے گا جب کھلا کر غنچۂ نو اک پھوٹے گا

کوئی عقیدہ ہو اس پر جامد ہو جانا باطل ہے
مُہمل ہے یہ حتمیت، ہر رنگ کسی دن چھوٹے گا

ٹوٹتے رہتے ہیں کُلیے، دُنیا کی یہ فطرت ہے
میں نے پُوچھا آپ کا یہ کُلیہ کس دن ٹوٹے گا

ایک شام

(دریائے نیکر کے کنارے پر)

یہ شام یہ زالِ سالخوردہ
شب ہائے مہیب کا فشردہ
بے کیف شعورِ شادیٔ مرگ
بے جان سی نبض ہائے دل برگ

اقبال کے گوشۂ حق نما میں
اس شام کی بیکراں خموشی
اک خواب لطیف کی تھی لوری

لیکن میں جنم جنم کا جوگی
کس نیند سے سکھ کی بھیک پاؤں
کس بستر عافیت پہ لیٹوں
کس خواب کو میں گلے لگاؤں

بیداری مستقل کے ہمدوش
مقسوم خرد ہے بے نوائی
ہجرت زدگی کا لے کے کاسہ
کب تک کروں در بدر گدائی

اک قریۂ خواب سے گزرنا
پھر دشت سراب سے گزرنا

جو خلوتِ رمزِ ماہیت ہے
اس کوچۂ خواب سے گزرنا
فردوسِ ابد کی جستجو میں
ہونے کے عذاب سے گزرنا

میں چھان چکا نظامِ شمسی
میں ارض و سما کو دیکھ آیا
کہتی ہے جسے خردِ حقیقت
عنقا کی اڑان کا ہے سایا

شیشے کے ضمیر میں ہے پتھر
لوہے کے خمیر میں ہے ریشم

سورج کی نمود میں ہے ظلمت
زخموں کے وجود میں ہے مرہم

شاید کہ زمیں کی رفعتوں
میں بام فلک پہ گر پڑا ہوں
شعلے تو چتا کے بجھ چکے ہیں
اب اپنی ہی راکھ پر کھڑا ہوں



جنگلوں کی نیم شب

جنگلوں کی نیم شب ہے
چاندنی کی رُت عجب ہے

ملگجی سی چاندنی میں
اجنبی سی روشنی میں
راستے کھوئے ہوئے ہیں
جانور سوئے ہوئے ہیں

خوف کی ٹہنی سے جکڑی
ایک کوئل بولتی ہے
جھاڑیوں میں کوئی ڈائن
اپنا جوڑا کھولتی ہے
اک بلائے ناگہانی
زرد شہپر تولتی ہے

رات کا پچھلا پہر ہے
چاندنی بالائے سر ہے

واہموں کا ایک لشکر
برچھیاں تانے کھڑا ہے
سُرخ ہے میداں لہو سے
عقل میں وہ رن پڑا ہے

ہر یقیں ڈوبا ہوا ہے
موجِ دریا سے گماں ہیں
کشتیوں کی طرح سے ہم
بہہ رہے ہیں (رائیگاں ہیں)
وقت کے سیلِ رواں ہیں

کیا خبر تھی اپنی ہستی
دشمنِ احساس ہوگی
جسم کی خانہ نشینی
روح کا بن باس ہوگی
علم کی بے مقصدیت
عقل کا افلاس ہوگی

تجربوں کی تشنہ کامی
آبِ خنجر مانگتی ہے
یہ خطا پیشہ بھکارن
عقل کا سر مانگتی ہے

ہر نفس ابہام پرور
ہر قدم اوہام گستر
عالمِ موجود یک سر
جنگلوں کی نیم شب ہے

پسِ طومارِ خرد

اونگھتی شام ڈوبتا خورشید
سرنگوں شوقِ عزم و کیفِ اُمید

سینۂ بحر پہ صد تزئین
سرخ کرنوں کا ریشمی قالین

سلسلے کوہسار کے تا دُور
قد پہ نازاں شکوہِ پُرغرور

ماہی گیروں کے گاؤں کے آثار
سادہ و بے ریا در و دیوار

ریوڑوں کو لیے سِدھارے ہے
پاشکستہ غریب چرواہے

ساحلی بستیوں کی طرح اُداس
بے دِلی کا ڈسا ہوا احساس

○

بےکرانی میں گم ہوئے آفاق
منتشر ہیں خیال کے اوراق

دِل میں اِک بیکراں اُداسی ہے
رُوح جیسے ازل سے پیاسی ہے

مُردنی ہے جواں امنگوں پر
گرد ہے زندگی کے رنگوں پر

شامِ راحت طلب کی ضربت سے
گر پڑا عزمِ شاخِ ہمت سے

قلزمِ شب میں روز ڈوب گیا
مہرِ عالم فروز ڈوب گیا

کارواں حوصلوں کے گرد ہوئے
روشنی کے چراغ سرد ہوئے

اوس پڑنے لگی ارادوں پر
چھا گئی دھند دل کے جادوں پر

دیپ جلنے لگے مکانوں میں
لوگ جا بیٹھے سائبانوں میں

جگنوؤں کے چراغ جلنے لگے
زخمی سینوں کے داغ جلنے لگے

تنگ دروں کو نیند آنے لگی
تیرگی گھاٹیوں پہ چھانے لگی

شب گزرنے لگی درندوں پر
نیند اُترنے لگی پرندوں پر

چرخ پر اِک ستارہ تنہا
شب کی تاریکیوں میں چونک اُٹھا

فاختاؤں کی سُرمئی آواز
کر گئی آسمان میں پرواز

ہو چلی تنگ چاند کی آغوش
روشنی کے گجر ہوئے خاموش

گونجتی ہے فضا میں دُور و دراز
بانسری کی بھنچی ہوئی آواز

○

بانسری کی بھنچی ہوئی آواز
اپنی لَے میں لیے غزل کا گداز

یہ فضا کیا ہے یہ خلا کیا ہے
جب نہ تھا کچھ تو پھر ہوا کیا ہے

اِک اضافت کے رُخ بدلتے رنگ!
اجنبی کیا ہے آشنا کیا ہے

ہے ورا ر الورا میں کون مکیں
اور پھر اس کے ماورا کیا ہے

تپشِ ذوقِ بے ہنر کیوں ہے
خلشِ قلبِ نارسا کیا ہے

چاندنی میں اداسیاں کیوں ہیں
دھوپ میں یہ غبار سا کیا ہے

ایک ہی شے ہے جب وجود و عدم
لا و الا میں فاصلہ کیا ہے

بات کو لوگ کیوں سمجھتے ہیں
لفظ و معنی میں رابطہ کیا ہے

○

بانسری کی قبیلِ فسردہ ہے
یہ نوا کتنی زخم خوردہ ہے

ے ج ٥

شعلگیِ دل پہ چھائے جاتی ہے
اور اُداسی بڑھائے جاتی ہے

نَے نیستاں سے کٹ کے آئی ہے
بے گھری میں لپٹ کے آئی ہے

نَے فروشوں کے کسبِ زر کے لیے
نَے نوازوں کے رزقِ تر کے لیے

منڈیوں میں یہ بکتی رہتی ہے
ہجرتوں کے عذاب سہتی ہے

دھیمے لہجے میں کتنا شکوہ ہے
یہ بھی میری طرح سے تنہا ہے

کتنے لاچار کس قدر مجبور
میں بھی مجبور یہ بھی ہے مجبور

اس کی تانیں ہیں یا خیال کی رَو
کیفِ ماضی و کربِ حال کی رَو

دُور بکھرے حسین جادوں سے
اس کی جھولی بھی پُر ہے یادوں سے

شوخ دن ہیں سیاہ راتیں ہیں
گرم جلوے ہیں نرم گھاتیں ہیں

دل میں مایوسیوں کے آنسو ہیں
لب پہ محرومیوں کے جگنو ہیں

○

میں کہ اک بازگشتِ صحرا ہوں
اپنی محرومیوں میں زندہ رہوں

نارسا فکر، ناسزا جذبات
عقل کی روشنی پہ جہل کی رات

قلبِ خوابیدہ کنجِ راحت میں
عقل آوارہ دشتِ غربت میں

سوچتا ہوں یہ ارتقا کیا ہے
لا و الا کا سلسلہ کیا ہے

یہ قضا و قدر یہ غیب و شہود
یہ زمان و مکاں یہ بُود و نبُود

یہ وجُود و عدم یہ نفی و ثبُوت
یہ خلا و ملا یہ شور و سکوت

صرف الفاظِ بے معانی ہیں
یا معمائے جاودانی ہیں

بارہا چاکِ جاں کو ٹانکا ہے
میں نے کتنے کنووں میں جھانکا ہے

کبھی توڑی ہے تہہ حقائق کی
کبھی دھنکی ہے روئی منطق کی

دیکھ کر فلسفے کی حیرانی
خاک علمِ کلام کی چھانی

وہ تصوّف ہو یا کہ ہو عرفان
ان کو بھی دے چکا ہوں میں تاوان

رمل و اعداد و جوتش و جادو
ان کے دامن کو بھی کیا ہے رفو

میں نے ہر شک کو معتبر رکھا
یعنی ہر آستاں پہ سر رکھا

مصر کے گھر بے چراغ رستوں میں
ہند و یوناں کے بُت پرستوں میں

رُوم کے کہنہ تر خرابوں میں
کرم خوردہ پھٹی کتابوں میں

شجرِ معرفت کی شاخوں پر
جرمنی کے قدیم کاخوں پر

میں نے تاریخ کو بھی جانا ہے
میں نے آثار کو بھی چھانا ہے

میں کہ تھا بے دیار و آوارہ
کوچۂ نارسی کا بنجارہ

کبھی دہلی کبھی بنارس میں
گاہ ترکی میں گاہ فارس میں

ہائیڈل برگ کی ہواؤں میں
سوئٹزرلینڈ کی فضاؤں میں

ساحلِ ہیگ کے نظاروں میں
ایمسٹرڈم کے نرم دھاروں میں

ہیوسٹن کی اداس راتوں میں
بوسٹن کی لطیف گھاتوں میں

شام و لبناں کے کوہساروں میں
کافرستاں کے دیوداروں میں

میں مگر صیدِ بے دلی ہی رہا
اجنبی تھا تو اجنبی ہی رہا

○

کربِ تحریر سے مرا خامہ
کر رہا ہے رقم سفر نامہ

شہرِ بابل کے خوابناک کھنڈر
نینوا کے شکستہ بام و در

ناصرہ کے مٹے ہوئے آثار
بعلبک کے کمر خمیدہ دیار

سر اٹھاتے ہوئے بلند اہرام
ماورائے نہایت و انجام

ہر فضا سوز و کرب میں ڈوبی
زنجبار اور قصرِ مرہوبی

کوہِ الموت کا قدیم حصار
سر نہادہ گری ہوئی دیوار

تختِ جمشید کی کہن سالی
بے ستوں کی مہیب بدحالی

کون سی شے مری نظر میں نہیں
کیا ہے سودا، جو میرے سر میں نہیں

میں رہا برق و بادِ تند کے ساتھ
ابر و باراں کی نرم دھند کے ساتھ

میں گیا مرقدِ خموشاں میں
میں چلا کوئے بُت فروشاں میں

دھوپ اُترتی رہی چناروں پر
سونا چھا گئے مزاروں پر

میں گم مستقل سفر میں رہا
کوہ و صحرا و دشت و در میں رہا

ریچھ کی طرح معاش رہی
برف میں رزق کی تلاش رہی

کوہ و صحرا میں کاٹنا دن رات
گھومنا بھیڑیوں کے غول کے ساتھ

بندروں سے معاشرت رکھنا
اژدروں سے مصاحبت رکھنا

ناریل کی ہوائیں کھو جانا
لونگ کی جھاڑیوں میں سو جانا

ہم سفر ہو کے مار و عقرب کا
شاخِ صندل پہ کاٹنا شب کا

کبھی تنہائیوں میں گل چننا
کبھی شہنائیوں پہ سر دھننا

کبھی آبادیوں میں چکرانا
کبھی بربادیوں سے ٹکرانا

کبھی اُڑنا ہوائے عصیاں میں
کبھی مُڑنا حریمِ ایماں میں

کبھی رُکنا ازل کی ساحت میں
کبھی جُھکنا ابد کی خلوت میں

کبھی ناگفتنی کے سینے میں
کبھی اظہار کے سفینے میں

○

میں نے ہر در پہ جا کے دستک دی
میں نے ایقاں کو وسعتِ شک دی

میں نے جانا کہ آدمی کیا ہے
آدمی کی شکستگی کیا ہے

سر بسر احتیاج کیوں ہے بشر
متلوّن مزاج کیوں ہے بشر

مگر اس جاننے سے کیا حاصل
وسوسے چھاننے سے کیا حاصل

شمع جاں ہزیمت کے طاق میں ہے
آگہی وہم کے رواق میں ہے

وہم ایقان کا اشارہ ہے
موت جینے کا استعارہ ہے

سرِ جاں ہے یہ رمزِ نادرہ کار
کہ یقیں کیا ہے؟ وہم کی تکرار

جب کوئی وہم ہو تسلسل سے
عقلِ انساں اسے یقیں سمجھے

جس گماں میں شعور ڈھل جائے
وہ گماں خود یقین بن جائے

میں نے دیکھا بطونِ اشیا میں
میں نے پایا یقیں کی دنیا میں

نظریات کا گھنا جنگل
جابجا اعتقاد کی دلدل

واہمہ کی کرشمہ کار فضا
سر بسر ضدِ اعتبار فضا

خود پسندی میں حل شدہ افکار
یعنی میراثِ جہل و استکبار

رمزِ غیب و حضور لاحاصل
علتوں کا شعور لاحاصل

کائنات اک وجودِ بے علت
مادہ جس کی اصل ماہیت

آسماں پیاز کی تہوں جیسے
کچھ نہ در آئے جن میں ٹھوس ایسے

چاند میں سو رہی ہے اک بڑھیا
پاس رکھا ہوا ہے اک چرخا

یہ جو اپنی زمیں کا گولا ہے
گائے کی سینگ پر یہ رکھا ہے

یہ خرافات عہدِ ماضی کے
یہ عدو منطق و ریاضی کے

یہ گماں فکر کے مراحل ہیں
خوف گن ہیں یقیں کی منزل میں

شمعِ منزل ہے تیرگی کی نقیب
گمرہی ہے ہر اک سفر کا نصیب

بندگی کیا ہے چشمِ بینا میں
کیا ملا بستگی کے صحرا میں

بندگی کا نظامِ زنگ آلود
یعنی آبا پرستیوں کی نمود

شارحِ آہوئے عاشقوں کی برات
یعنی کنفیوشیس کی تعلیمات

ثنویت کی زخم خوردہ پشت
باربردارِ شعلۂ زرتشت

بے سکونیِ ضمیرِ گوتم کی
ایک پرچھائیں حرفِ مبہم کی

○

میں بہ این زعمِ حکمت و برہان
ہمہ تن جہل و سر بسر نادان

علم و قدرت کی ضدِ نامقبول
پست و دوں فطرت و ظلوم و جہول

کربِ ایجاد لکھ رہا ہوں میں
اپنی رُوداد لکھ رہا ہوں میں

○

میں نے تا عمر جو فروشی کی
لاج رکھی سفید پوشی کی

مجھ سے گندم نمائیاں نہ ہوئیں
ذات کی جگ ہنسائیاں نہ ہوئیں

پھر بھی لہجے میں جو بلندی ہے
جہلِ مطلق کی خود پسندی ہے

مجھ سے سرزد ہوتی ہے جو تنقید
وہ بھی ہوش و خرد کی ہے تردید

○

اب کہ حاصل ہوا ہے آتم گیان
اب ہوا کائنات کا عرفان

اِک حکیمِ کم آشنائی دلیل
سخت فکری مغالطے سے علیل

کیا ہے یہ گر نہیں ہے جہلِ فزوں
"سوچتا ہوں میں، اس لیے میں ہوں"

پہلے ہیں کا وجود فرض کیا
"سوچتا ہوں" پھر اس پہ عرض کیا

عقل ہے اس دلیل پہ ساکت
جو تھا ثابت وہی ہوا ثابت

یعنی حاصل جو ہے اسی کا حصول
جستجوئے اصول بہرِ اصول

نیولا سانپ کی پناہ میں ہے
شیر گیدڑ کی بارگاہ میں ہے

○

طفلِ نافہم ہو کہ دیوانہ
مردِ بے عقل ہو کہ فرزانہ

ذائقہ زندگی کا چکھتا ہے
اپنے ہونے کا علم رکھتا ہے

وہ پرندے ہوں یا کہ ہوں اسماک
ان کو بھی ہے وجود کا ادراک

اعتبارِ انا بدیہی ہے
اپنے ہونے کا علم فطری ہے

یہی ہونا چراغِ ایماں ہے
تربیت سازِ علم و ایقاں ہے

اسی ہونے پہ علم تُلتا ہے
فکر کا در یہیں سے کھلتا ہے

اسی ہونے کا ایک نام ہے وقت
ورنہ اک ذات بے مقام ہے وقت

اسی ہونے کا ایک رُخ ہے جہت
فرشِ خاکی کہ آسمان کی چھت

اصطلاحاتِ علم و فن و ہنر
ایک "ہونے" کے مختلف پیکر

سارے مفہوم ذہنِ انساں کے
ہیں ردائے وجود کے ٹانکے

○

عقلِ بیدار کی گھنی پلکیں
نیند کی وحشتوں سے بوجھل ہیں

ڈھل رہی ہے خیال میں محراب
دِل پہ گویا اُتر رہی ہے کتاب

ابد آسا فضا خرام میں ہے
آدمی وقت کے دوام میں ہے

یہی نقطہ ہے ابتدائے سفر
یہی منزل ہے انتہائے سفر

نقطۂ اختتام دشت ہے یہ
اک مسافر کی بازگشت ہے یہ

سب کے رنگ اس کے آگے ہلکے ہیں
یہ اجالا ہے سب دھندلکے ہیں

وقت اگر آدمی سے رام ہوا
آدمی کا سفر تمام ہوا